ISSN 0974-7346

نومبر ۲۰۲۴ء

جلد۲۱۱ــــعدد ۱۱

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۳۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۳۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۳۵۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر: 0504010100046001

آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

(Ma'arif Section) 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱ | ماہ ربیع الثانی ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۲۴ء | عدد ۱۱

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

شذرات

اترپردیش کے خطہ اودھ میں ایک قدیم بستی بہرائچ کے نام سے ہے۔ اودھ اور یوپی کے بعض دوسرے اضلاع اور شہروں کی مرکزیت، ترقی اور وسعت سے الگ یہ ایک خاموش اور نسبتاً پس ماندہ ضلع ہے۔ لیکن اس کی پس ماندگی کا شکوہ زبان پر اس لیے نہیں آپاتا کہ یہ گم نام بستی، ایک ہستی کی وجہ سے صدیوں سے عقیدت و محبت کا مرکز اور اسی لیے نیک نام ہوتی آئی ہے۔ اس عقیدت اور محبت کے اظہار میں ہندو مسلمان، چھوٹے بڑے سب یکساں طور پر شامل ہیں۔ ایک غازی اور شہید کو عام انسان کی زبان سے "بالے میاں" کا پیارا خطاب ملنا یہ مذہب اور ذات پات کے امتیاز و فرق کے باوجود احترام آدمیت، یک جہتی اور رواداری کی اس روایت کی پاسداری ہے جہاں مذہبی اور روحانی شخصیتوں کے احترام اور ان کے تقدس کی عملداری اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ بالے میاں یعنی سالار مسعود غازی کی شخصیت کے خط و خال اگرچہ تاریخ کے آئینے میں زیادہ واضح نہیں نظر آتے مگر تاریخ کا ایک مصدر اگر عوامی روایات اور ان کا تسلسل ہے تو اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ محمود غزنوی کے لشکر سے وابستہ تھے۔ یہ وابستگی تاریخ کے اس موڑ پر تھی جب ہندوستان کی سرزمین اسلام کے ابر کرم سے سیر اب ہونے لگی تھی۔ سالار مسعود کے والد سالار ساہو کا مزار آج بھی بارہ بنکی کے قریب ستر کھ میں گزری ہوئی بہار کا پتہ دیتا ہے۔ بہرائچ یہاں سے دور نہیں، باپ کی طرح بیٹے سالار مسعود نے اس سرزمین سے اپنی محبت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ حشر تک ہمارا یہاں مقام ہو گا، اس زمین میں بوئے وطن ہے، ہمارا یہی مدفن ہے۔ قریب ہزار سال گزر گئے۔ محبت، رواداری، دوست، دشمن، شکست و فتح، بہرائچ کو بہشت بنانے کی محبت اور پھر وہیں جام شہادت نوش کرنے کی قسمت، یہ ساری باتیں تاریخی واقعات سے زیادہ روایتی قصوں اور داستانوں میں بدل گئیں۔ سلطنتیں اور حکومتیں بدلتی رہیں، تخت و تاج پر قبضے ہوتے رہے لیکن ایک چیز نہ بدلی اور وہ تھی سالار مسعود کی عوامی محبوبیت۔ ہر سال ان کے مزار پر خلقت جمع ہوتی رہی، اپنے اپنے معیار اور احوال کے لحاظ سے عرس اور میلے ہوتے رہے۔ منتوں اور مرادوں میں کسی مذہب اور دھرم کی تخصیص نہیں رہی۔ ڈیڑھ سو برس پہلے کی ایک کتاب غزانامہ مسعود کے صفحات میں سالار مسعود کے ضمن اور حوالے سے اس قسم کے جملے نقل کیے گئے کہ "پروردگار عالم نے بعد حرمین شریفین کے ہند کو وہ رتبہ اعلیٰ عطا فرمایا جو کسی دوسری اقلیم کے حصے میں نہ آیا"۔

***

یہاں ماضی کی ان جھلکیوں کو پیش کرنا مقصود نہیں، مگر اس وقت ملک میں قانون کے نام پر جولا قانونیت ہے اور جمہوریت کے نام پر فسطائیت، دھرم کے نام پر نفرت اور سیاست کے نام پر مکر و فریب کی گرم بازاری نے اور بہرائچ میں اس کے رقص شرر کے نہایت جاں گداز مناظر نے جو تازہ زخم دیے، اس نے سوچنے پر مجبور کیا کہ صدیوں سے چلی آتی ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کی روایتوں کی اس بربادی کا عنوان کیا ہو۔ مذہبی تہواروں، رسموں اور جلوسوں میں سادہ لوح عوام کی عقیدت مندانہ شرکت کوئی نئی بات نہیں۔ مگر ادھر چند برسوں سے جھوٹ کی بنیاد پر تاریخ اور مذہب و تہذیب کی سچائیوں کو مسخ کرنے کا جو عمل تیز تر ہوا ہے اور محبت اور تعلق کے خوشگوار رشتوں کو مذہبی قومیت کے نام پر نفرت اور انتقام کی آگ سے خاکستر کیا جارہا ہے۔ اس نے بہرائچ کو بھی اپنا نشانہ بناکر ہر روز نئے طرز ستم کی ایجاد کی عادی ہوتی دنیا کے لیے اس کے غم و اندوہ میں اور اضافہ کردیا۔ جن لوگوں کے بزرگوں نے اس سرزمین کو اشرف البلاد کا نام دیا، ان کے مکانوں، دوکانوں حتی کہ شفاخانوں کو اس طرح تاراج کیا گیا گویا انسانیت ہی راکھ کے ڈھیر میں بدل گئی۔ عمروں کی کمائی، چند ساعتوں میں خاک میں مل گئی۔ آگ لگانے والے کبھی اپنے قابو میں نہیں رہتے مگر اس بار قانون کے نام نہاد محافظوں نے رقص ابلیس کے تماشے کے لیے اور نفرت کے نشے سے بے قابو ہونے کے لیے دو گھنٹے ان فسادیوں کے حوالے کردیے اور پھر جو بچ گیا وہ آئین اور دستور کی قسم کھانے والوں نے بلڈوزر کی مدد سے تہہ و بالا کردیا۔ عجیب معاملہ ہے چند ہفتوں پہلے اسی بہرائچ میں بھیڑیوں نے راتوں کی نیندیں حرام کررکھی تھیں ان کو قابو میں لانے کے لیے بڑے پیمانے پر مہم چلائی گئی مگر ان بھیڑیوں کو خبر نہ تھی کہ خود انسان کی شکل میں ان سے زیادہ خونخوار درندے بھی ہیں، جانور تو مذہب نہیں دیکھتے مگر یہ بدنصیب درندے، انسانیت کے معمولی احساس سے بھی عاری ہیں۔

***

قتل بھی ہوا، غارت گری بھی ہوچکی اور اب سیاست کے بازی گروں کے تماشوں کی وہ تصویریں بھی سامنے آنے لگیں جو سازشی ذہن، فسطائی مزاج اور اقتدار کی شیطانی خواہشوں کو حیرت کا سامان بناتی ہیں۔ عوامی ذرائع اطلاعات اور بعض بڑے اخباروں کی خفیہ تفتیشی رودادوں کا ایک بازار گرم ہے۔ یہ بھی اشرف البلاد کو ارذل البلاد میں بدلنے والا ایک تماشہ ہے۔ اس کا اب کیا غم اور کیا گلہ۔ گلہ تو پھر ان ہی سے ہے جن کو سالار مسعود کی وراثت کا دعویٰ ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ایک بڑی اقلیت کے ساتھ جو زیادتی اور ناانصافی شروع ہوئی، اس کا شکوہ ہمارے بزرگوں کی زبان اور قلم سے مسلسل ہوتا رہا۔ ملک عزیز کے نقشے میں نئی لکیروں، نئے رنگوں کی چمک تیز اور پھیکی

ہوتی رہی، لیکن جن کی تصویر سب سے زیادہ دھندلی اور بدلی ہوئی ملی ان کو احساس ہی نہیں ہوا کہ:

ہمیں سے آج اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی

***

ہمارے بزرگوں نے تقسیم ملک کے بعد اقلیتی قوم کی دو نسلوں کے فرق کی طرف اشارہ کیا کہ نئی نسل کو اپنے دین و مذہب، عقائد و اعمال، اپنی تاریخ و تہذیب اور تمدن و ثقافت سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا بلکہ ایک ایسی نسل سامنے آنے لگی جس کے لیے اپنی روایات، قومی و ملی تشخص، اپنی تعلیم اور سب سے بڑھ کر اپنی زبان ہی بیگانہ ہوگئی۔ معارف نے اس دور کو "ظلمت ایام" کا نام دیا، جہاں راتیں ہی سیاہ نہیں دن بھی کالے ہوگئے۔ پھر اس تاریکی اور سیہ بختی میں اپنی تعمیر و ترقی کی تدبیریں، مذہبی و گروہی اختلافات کے خاتمہ کی سبیلیں، تعلیم کے ذریعہ بلند مقاصد کو پانے کی راہیں اور سیاسی شعور و بصیرت اور وقت کے مطابق صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں کیا نظر آتیں۔ قیادت کے نام پر مذہب و ملت کی خیر خواہی کے چند جملوں کی مدد سے جہاں دیکھیے، کوئی طالع آزما، زبان و بیان سے اپنا تعارف یوں کراتا ہے کہ اس کو خود قتیل شیوۂ آزری اور ہلاک جادوئے سامری ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ دوسری جانب جو لوگ اشک سحر گاہی سے وضو کرتے اور دعائے نیم شبی میں لبوں کو لرزش خفی و جلی سے آشنا کرتے ہیں وہ ملت کے مزید انتشار کے خدشے سے لبوں کو سی لینے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ دل کا درد ایسا کہ وہ اپنے وجود کا اعلان بھی نہیں کرپاتے۔ یہ وہ اہل نظر ہیں جن کو اپنی آبرو کی فکر ہے، دوسری طرف ہر بوالہوس کو دعوائے حسن پرستی ہے۔ وقتی، مقامی اور محدود مفادات کی حریص سیاست نے جو رنگ دکھائے، اس کا خمیازہ صرف ایک قوم کو بھگتنا پڑتا تو بھی اتنا غم نہ ہوتا۔ دکھ اس سے زیادہ اشرف البلاد کو ارذل البلاد میں بدلتے دیکھنے کا ہے۔

***

خوشی کی ایک بات یہ ہے کہ ہمارے ایک فاضل محقق ڈاکٹر اکرم ندوی، انگلستان میں رہ کر عربی زبان میں علوم اسلامیہ کی تحقیق و تدوین اور نشر و اشاعت کا وہی فریضہ انجام دے رہے ہیں جو علمائے ہند کو ایک زمانہ سے دوسروں سے ممتاز کرتا آیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے کتب خانہ دارالمصنفین کے لیے اپنی نئی تالیف الجامع المعین فی طبقات الشیوخ المتقنین والمجیزین المسندین ہدیہ کی ہے۔ کتاب سات جلدوں میں ہے، موضوع نام سے ظاہر ہے۔ متحدہ عرب امارات کے ادارہ طارق الاثرم نے اس کو بڑے اہتمام سے شایع کیا۔ فاضل مولف لائق تبریک و تحسین ہیں۔ ہم اس قیمتی سوغات کے لیے ان کے مشکور بھی ہیں۔

***

مقالات

عرب نژاد مسیحی شعراء اور نعت رسول: ایک جائزہ

ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرّب مرزا
استاد، عربی زبان وادب، الہ آباد یونیورسٹی -پریاگ راج، یوپی
mmjamaliindia@gmail.com

صحابۂ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے جس والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے اس کی تاریخ انسانی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ دشمنانِ اسلام بالخصوص کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں، حملے کئے اور جانی ومالی نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مگر جب آپ ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر ان لوگوں نے ہجویہ قصائد کہنا شروع کیا تو رسول اللہ ﷺ پر یہ بہت شاق گزرا، اس لئے نہیں کہ کفار مکہ ہجویہ اشعار کے ذریعے شان اقدس ﷺ میں نازیبا کلمات کہتے یا آپ ﷺ پر طنزیہ فقرے کستے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے پس پردہ اسلامی عقائد وتعلیمات پر بے جا اعتراضات اور تنقیدیں کرنے لگے تھے۔ ان کے اسی طرح کے ہجویہ کلام سے پریشان ہو کر ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ انصار سے فرمایا: ”جو لوگ اپنے ہتھیاروں کے ذریعے اللہ کے رسول کی مدد کرتے ہیں، انہیں زبانوں کے ذریعے مدد کرنے سے کس چیز نے روکا ہے؟“[1]۔ آپ کے اس قول کا اثر تھا کہ دربارِ رسالت سے وابستہ شعراء نے اپنی شعری توانائیاں اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے دفاع میں صرف کیں اور کفارِ قریش کی ہرزہ سرائیوں کا مسکت جواب دیا۔

ایک زمانے تک عرب معاشرے میں شعر و شاعری کو جنون کی حد تک پسند کیا جاتا تھا۔ شاعرانہ کلام سے کسی بھی شخص کی تذلیل یا اس کے رتبے کو گھٹایا بڑھایا جا سکتا تھا۔ عصر حاضر میں

---

[1] ضیف، شوقي، تاریخ الأدب العربي، العصر الإسلامي، دار المعارف، قاہرہ، ط ۲۰، ص ۴۷۔

جس طرح دشمنوں کے پروپیگنڈے کو روکنے کے لیے جدید ذرائع ابلاغ یا سوشل میڈیا کو ایک کارگر اور مؤثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح یہ کام عرب اُس زمانے میں شعر و شاعری سے لیا کرتے تھے۔ ضرار بن خطاب، ابوسفیان بن حارث، عمرو بن العاص، کعب بن اشرف اور عبداللہ زبعری جیسے بڑے شعراء نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ رسول اللہ ﷺ پر طنز، سب و شتم، استہزاء و استخفاف اور رسالت کی توہین کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ یا دیگر شعراء کا رسول اللہ ﷺ کی مدح و ثنا یا اوصاف حمیدہ کا بیان دراصل کفار مکہ کے ہجویہ اشعار کے ردّ عمل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر ان کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے "اللهم أيّده بروح القدس" حالانکہ یہ اشعار آنحضرت ﷺ کی مدح میں ہوتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسانؓ کے اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھے۔ عرب میں شعراء کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ زور کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے۔ ابن الزبعری اور کعب بن اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت ﷺ کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسانؓ کی مداحی اس کا ردعمل تھا[۲]۔

طلوع اسلام کے بعد سے ہی جن شعراء نے نبی کریم ﷺ کی شان میں مدحیہ قصائد لکھے ان میں سب سے نمایاں حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن زہیر رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ حضرت حسان بن ثابتؓ ایک موقع پر آپ ﷺ کے حسن و جمال کی توصیف میں یوں رطب اللسان ہیں[۳]:

وأحسن منك لم تر قط عيني — وأجمل منك لم تلد النساء
خُلقت مبرءاً من كل عيب — كأنك قد خلقت كما تشاء

(آپ سے زیادہ حسین شخص میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا، اور آپ سے زیادہ خوبصورت شخص کسی ماں نے نہیں جنا۔ آپ کو تمام عیوب سے اس طرح پاک پیدا کیا گیا، گویا آپ ﷺ کی تخلیق آپ کی مرضی و مشیت کے عین مطابق کی گئی)۔

---

[۲] نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، حصہ دوم، ص ۲۵۸۔

[۳] دیوان حضرت حسان بن ثابت انصاری، تحقیق و ترجمہ: مولانا محمد اویس سرور، مکتبہ رحمانیہ، اقرا سنٹر، لاہور، ص ۲۵۔

اموی دور کے سب سے نمایاں شعراء الفرزدق اور کمیت الاسدی نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی محبت، خلوص اور وفاداری کا کھل کر اظہار کیا۔ عباسی دور میں جن شعرا نے رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں نعتیہ کلام پیش کئے ان میں الشریف الرضی اور دعبل الخزاعی سب سے زیادہ مشہور رہیں۔ ممالیک کا زمانہ آیا تو نعت رسول ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ساتویں صدی ہجری میں محمد بن سعید البوصیری کا بے حد مشہور قصیدہ "البردۃ" (پورانام الكواكب الدرية في مدح خير البرية) منظر عام پر آیا۔ یہ قصیدہ اتنا مشہور ہوا کہ عربی، فارسی اور اردو شعراء نے اس پر خوب تضمینیں کیں یہاں تک کہ آج بھی اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ محمود سامی البارودی جیسے جدید عربی ادب کے نامور شاعر نے قصیدہ "البردۃ" کے طرز پر ایک قصیدہ کہا جس کا عنوان "كشف الغمة في مدح سيد الأمة" ہے۔ امیر الشعراء احمد شوقی نے بھی اسی طرز پر ایک قصیدہ لکھا جس کا عنوان "نہج البردۃ" رکھا۔ اس طرح نعتیہ شاعری بے حد مقبول فن کے طور پر متعارف ہو گئی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں اس قدر کشش ہے کہ وہ تمام شعراء، ادباء اور مفکرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ آپؐ کی تعریف و توصیف کے وقت شعراء پر ایک خاص قسم کی کیفیت اور دل و دماغ میں آپؐ سے محبت و انس کا والہانہ جذبہ غالب ہوتا ہے جو کسی بھی دوسرے شخص کی مدح میں کبھی طاری نہیں ہو سکتا۔ بہ حیثیت انسان یہ آپ کا امتیاز و اختصاص ہے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک مسلمان اپنی جان سے بھی زیادہ سرور کائنات ﷺ سے محبت کرتا ہے اور یہی اس کے ایمان کے مکمل ہونے کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم شعراء نعت گوئی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں آج بھی کوشاں نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے تئیں وہ اپنے جذبات اور احساسات کا بکثرت اظہار کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی محبت میں سرشار ہو کر آپ ﷺ کی پیروی کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی محبت کو ایمان و اسلام کا جزء لاینفک سمجھتے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں کے وہ شعراء جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، انہوں نے بھی ایسی شاہکار نظمیں لکھی ہیں جو مدح نبوی کے باب میں مسلم شاعروں سے کم دلچسپ نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے تئیں اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس کی بظاہر وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسی شخصیت کے حامل ہیں جنہوں نے اپنی تعلیمات میں قوم و مذہب سے اوپر اٹھ کر خدمت انسانیت کو لازم قرار دیا ہے۔ رواداری، حسن اخلاق اور غیر جانب داری کے اصولوں کو عام

کیا۔ غیر مسلموں کو ان کی مذہبی رسومات پر عمل کرنے کی مکمل اجازت عطا کی اور آپؐ خود اپنی معاشرتی زندگی میں سراپا عفو و درگزر کے پیکر نظر آتے ہیں۔

اس کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ان تمام دشمنوں کو معاف فرما دیا جنھوں نے چند ماہ نہیں بلکہ تیرہ سال تک مکہ میں آپ ﷺ پر اور صحابۂ کرامؓ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے اور آپ کو اپنا محبوب وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان پر مکمل قابو پانے کے باوجود آپ ﷺ نے مشرکین مکہ سے ارشاد فرمایا: "جاؤ تم سب آزاد ہو!"[۴]۔

حقیقی فضل و کمال تو وہ ہوتا ہے جس کی گواہی دشمن دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی دیکھا جارہا ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے شعراء کی ایک بڑی تعداد آنحضورؐ کی مدح و توصیف میں رطب اللسان اور عشق رسول ﷺ میں سرشار ہے۔ انھوں نے حضور ﷺ کی مدح و ثنا میں بکثرت قصیدے کہے ہیں، آپ ﷺ کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے، آپؐ کی فضیلت و برتری اور انفرادیت کو تسلیم کیا ہے، آپؐ کی بہادری اور جرأت مندی کے قائل ہوئے، آپؐ کی منفرد اور بے مثال شخصیت کے دلدادہ ہوئے اور آپؐ کی سچائی اور صداقت کے آگے سر تسلیم خم کیا۔

عرب نژاد مسیحی شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے آپ ﷺ کی شان میں بہت سے مدحیہ قصائد کہے ہیں۔ ان کے علاوہ برّصغیر کے بھی ہندو، سکھ اور عیسائی شعراء نے نہ صرف سیرت طیبہ کا صدق دل سے مطالعہ کیا بلکہ آپؐ کی عقیدت میں وہ اسلامی تعلیم و مزاج کو اس حد تک پی گئے تھے کہ ان کے اشعار سے پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کا قائل ایک مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ ان ادیبوں اور شاعروں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ان میں جگ دیش مہتا درد، جگن ناتھ آزاد، مہاراجہ کشن پرساد شاد، پنڈت ہری چند اختر اور کنور مہندر سنگھ بیدی نمایاں ہیں۔ یہاں مسیحی عرب نژاد شعراء کے کلام کا ایک مطالعہ پیش ہے۔

ان عرب نژاد مسیحی شعراء میں سب سے نمایاں شاعر رشید سلیم الخوری ہیں۔ وہ اسلام اور عربیت کی عظمت پر فخریہ اشعار کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر وہ اشعار جو انھوں

---

[۴] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۵۵ / ۴، مصطفی السقا، ابراہیم الابیاری، عبد الحفیظ شلبی، مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی واولادہ، مصر، ۱۹۳۶ء۔

نے میلاد نبوی کے موقع پر "نحن أُعطينا القلم" (ہمیں قلم دیا گیا ہے) کے عنوان سے پڑھا تھا۔ ان اشعار میں فخریہ انداز میں انھوں نے کہا کہ ہم عربوں کو غلبہ حاصل تھا نیز قوموں کی ترقی اور خوشحالی کا سہرا ہمارے سر پر ہی ہے جب کہ اس وقت مغرب پسماندگی اور تاریکی کے بوجھ تلے دبے رہے[۵]۔

نحن الألى سدنا الشعوب ونحن مدنا الأمم
طلع الهدى من شرفنا والغرب يخبط في الظلم

(ہم نے قوموں کی سرداری کی۔ ہم ہی نے قوموں کو عروج بخشا اور ہماری بزرگی سے ہی ہدایت نکلی جب کہ اس وقت مغرب تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا)۔

الخوری نے "عیدالبریۃ" (انسانیت کا تیوہار) کے عنوان سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں ایک نظم کہی ہے۔ اس میں اس نے مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے محنت کرنے کی تلقین کی۔ رسول اللہ ﷺ سے اپنے والہانہ محبت اور جذبے کا اظہار کیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے اور اپنے ملک اور پورے عالم مشرق کی خدمت کرنے کے لئے نعرہ بلند کیا اور لوگوں کو برادرانہ محبت پر ابھارا۔ اس مشہور نظم کے کچھ اشعار یہ ہیں[۶]:

عيد البرية عيد المولد النبوي في المشرقين له والمغربين دوي
عيد النبي ابن عبد الله من طلعت شمس الهداية من قرآنه العلوي
يا قوم هذا مسيحي يذكركم لا ينهض الشرق إلا حبنا الأخوي
فإن ذكرتم رسول الله تكرمة فبلغوه سلام الشاعر القروي

(مولد نبوی کا تیوہار ساری انسانیت کا تیوہار ہے جس کی گونج مشرق و مغرب میں ہے۔ فرزند عبد اللہ کا، جو کہ نبی ہیں، یہ تیوہار ہے جن کے بلند و برتر قرآن سے ہدایت کا آفتاب طلوع ہوا ہے۔ اے میری قوم یہ ایک عیسائی ہے جو تمھیں یاد دلا رہا ہے کہ مشرق ہماری برادرانہ محبت ہی سے دوبارہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اگر تم رسول اللہ کو عزت و اکرام سے یاد کرو تو ان کی خدمت میں شاعر قروی کا سلام عرض کر دینا)۔

شام کے ایک نامور شاعر الیاس قنصل نے اپنے اشعار میں رسول اللہ ﷺ کی مدح سرائی اور

---

[۵] مکتب التدقیق اللغوی، الشاعر القروی (الاعمال الکاملۃ) الشعر، جروس بریس، طرابلس، لبنان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۹۔
[۶] مکتب التدقیق اللغوی، الشاعر القروی (الاعمال الکاملۃ) الشعر، جروس بریس، لبنان، ص ۴۷۰۔

ان کے اوصاف حمیدہ کو بیان کرتے ہوئے کہا[۷]:

إني ذكرتك يا محمد ناشراً روح الأخوة في بني الإنسان
يعلو بلال العبد أشرف قبة ليذيع منها أشرف الألحان
حق المواهب أن يقدر أهلها لا فرق في الأجناس والألوان

(بنی نوع انسان میں بھائی چارے کو عام کرنے والے اے محمد (ﷺ)، میں نے تجھے یاد کیا۔ سب سے معزز گنبد پر غلام بلال چڑھ کر سب سے خوبصورت نغمے نشر کرتے ہیں۔ قابلیت اس بات کی مستحق ہے کہ رنگ و نسل سے اوپر اٹھ کر صاحب صلاحیت کی قدر کی جائے)۔

شامی شاعر وصفی قرنفلی رسول اللہ ﷺ کو "مشرق کا نجات دہندہ" قرار دیتے ہوئے نہ کسی منفی تنقید یا مذمت سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اپنے خلاف کسی جنگ سے خوف کھاتا ہے ۔ اپنی "منقذالشرق" (مشرق کا نجات دہندہ) نامی مشہور نظم میں رسول اللہ ﷺ کی سچائی اور صداقت کی گواہی دیتے ہوئے وہ کہتا ہے[۸]:

أو ليس الرسول منقذ هذا الشرق من ظلمــة الهوى والهوان
أفكنا لولا الرســول سوى العبدان بئست معيشة العبدان

(کیا رسول (ﷺ) اس مشرق کو ذلت ورسوائی کے اندھیروں سے بچانے والے نہیں ہیں۔ اگر رسول (ﷺ) نہ ہوتے تو ہم آج بھی غلام ہوتے، کیا ہی بُری زندگی ہے غلاموں کی!)۔

شام نژاد شاعر جارج صیدح نے "مُحَمَّد" کے عنوان سے نظم کہی جس میں اس نے نبی اکرم ﷺ کی مدح وثنا کے ساتھ ساتھ آپؐ کے بلند مقام اور عظیم کارناموں کا ذکر اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کیا کہ رسول ﷺ میں ہم سب کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہیں۔ اس نے عربوں کو ان کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کرنے کی پرزور حمایت کی کیونکہ آپ ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے میں ہی یقینی کامیابی اور سرخروئی کا راز مضمر ہے[۹]۔

وجهٌ أطلّ على الزمان لألاؤه شقّ العنان

---

[۷] خفاجی، محمد عبد المنعم، قصۃ الادب المہجری، دار الکتاب اللبنانی، بیروت، ۱۹۸۶ء، ص ۲۶۵۔
[۸] ابو العیون محمد، "شعراء مسیحیون نظموا اروع القصائد فی مدح النبی"، صوت الازہر، ۲۴ نومبر، ۲۰۱۷ء۔
[۹] کیالی، سامی، الادب العربی المعاصر فی سوریا، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۶۸، ص ۲۷۶۔

فيه شعاع النيرات وفيه أنفاس الجنان
يا صاحبيّ بأي آلا ء السماء تكذبان

(ایک چہرہ زمانہ پر جلوۂ افروز ہوا اور اس کی چمک دمک نے آسمان کو روشن کر دیا۔ اس میں روشنی کی کرنیں ہیں اور اس میں دلوں کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔ اے میرے دوستو، آسمان کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے)۔

یہ شاعر معراج نبوی پر گفتگو کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی مدح وثنا کو مسجد اقصیٰ کے جیسے اہم مسئلے سے ملا دیتا ہے، جسے یہودیوں کے شرم ناک قدموں نے روندر کھا ہے۔ وہ آپ ﷺ سے درخواست کرتا ہے کہ غاصب یہودیوں کی غلاظت سے مسجد اقصیٰ کو آزادی دلائیں۔ ساتھ ہی عربوں کی حالت زار پر بھی وہ سخت افسوس کا اظہار کرتا ہے:

يا من سرت على البراق و جزت أشواط العنان
آن الأوان لأن تجدد ليلة المعراج آن
عرج على القدس الشريف ففيه أقداس تهان

(اے براق پر سوار ہو کر آسمان تک جا پہنچنے والے! اب وقت آگیا ہے کہ تو شب معراج کی تجدید کرے اور بیت المقدس کا دوبارہ رخ کرے کیونکہ وہاں مقدسات کی پامالی ہو رہی ہے)۔

اپنی نظم کے اختتام میں صیدح دعاء کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے ان مومنین کے جہاد میں، جو ظلم کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرا رہے ہیں، برکتیں نازل فرمانے کی درخواست کرتا ہے اور ظالموں کے خلاف ان کی مدد کرنے کی بھی تاکہ سرزمین فلسطین کو نفرت انگیزی سے اور یہودیوں کی ظلم و زیادتی سے محفوظ کیا جا سکے:

بارك جهاد المؤمنين النافرين إلى الطعان
الضارعين إليك باسم الآل والصحب الغران
وبيوم مولدك السني وبحق موحيك القرآن
أن تصون دماءهم وامنح فلسطين الصيان

(ان مومنین کے جہاد میں برکت عطا فرما جو جنگ کے لئے نکل پڑے ہیں، جو تجھ کو تیرے روشن آل و عیال اور اصحاب کے نام سے پکارتے ہیں۔ تیری پیدائش کے دن سے، اور اس کے نام سے جس نے قرآن تجھ پر نازل فرمایا کہ ان کے خون کی حفاظت فرما اور سرزمین فلسطین کو تحفظ فراہم کر)۔

ایک اور شامی نژاد شاعر مشیل بن حافظ مغربی بھی پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ ﷺ کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے آپ ﷺ کی خوب مدح وستائش کرتا ہے اور اسلام کی وجہ سے عربوں کی

برتری کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ اسی نے عربی زبان کی حفاظت کی ہے۔"عيد المولد النبوي" (مولد نبوی کا تیوہار) سے معنون نظم میں وہ کہتا ہے(۱۰):

يا من طلعت على الفصحى و أمتها بنصر دين يضم الدهر سرمده
الضاد لولاك ما كانت مخلـــدة ولا رواها جمال أنت مـورده
إن كان للغرب عرفان و فلسفة ما أعطى مُحَمَّده فـــالشرق يكفيه

(اے وہ جو فصحی عربی اور اس کی قوم پر ظاہر ہوئے ایک ایسے مذہب کی نصرت سے جس کی ہمیشگی کا زمانہ ضامن ہے۔ اگر تو نہ ہوتا تو عربی زبان زندۂ جاوید نہ ہوتی اور نہ اسے آپ کی خوبصورتی سیر اب و شاداب کرتی۔ اگر مغرب کے پاس علم اور فلسفہ ہے تو مشرق کے لئے وہ کافی ہے جو اس کے محمد (ﷺ) نے اسے دیا ہے)۔

شام ہی کا ایک اور نامور مسیحی شاعر جاک صبری شماس ہے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی مدح وثنا میں ایک نظم "خاتم الرسل" کے عنوان سے متحدہ عرب امارات کے "البردة" انعام میں شرکت کے لیے کہی تھی۔ حالاں کہ وہ انعام حاصل نہ کرسکا تاہم اس مقابلے کے ذمہ داروں نے شماس کی شرکت کو اس مقابلہ کی سب سے زیادہ دلکش شاعرانہ شرکت سے تعبیر کیا۔ اس نظم کا ایک حصہ مندرجہ ذیل ہے(۱۱):

يممتُ (طهَ) المرَسَلُ الروحاني ويُجلَّ (طه) الشاعرُ النصراني
يا خاتمَ الرسل الموشح بالهدى و رسول نبل شامخ البنيـان
أَلقَى عليكَ الوَحي طهرُ عقيدة نبويةٍ همرت بفيض معـان
مهما أساء الغرب في إيلامـــه لم يرق هون للنبي البـاني
لا يحجب الغربال نور شريعة ويظل نورك طاهراً روحاني

(میں روحانی رسول (طٰہٰ) کا قصد کرتا ہوں اور یہ عیسائی شاعر (طٰہٰ) کی تعظیم کرتا ہے۔ اے ہدایت کے پیکر خاتم الرسل جسے بلند مقام پر فائز کیا گیا ہے۔ وحی نے آپ پر پاک پیغمبرانہ عقیدہ کو اتارا جو معانی کی کثرت سے لبریز ہے۔ مغرب الزام تراشی میں چاہے کسی بھی پستی میں چلا جائے مگر اس سے اس نبی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا جس کی صفت

---

(۱۰) اشتر، عبد الکریم، اوراق مهجرية، دار الفكر المعاصر، بیروت، ۲۰۰۲ء، ص ۳۴۔
(۱۱) الموقف الادبی، خاتم الرسل، جاک صبری شماس، شمارہ نمبر: ۴۶۱- ۴۶۲، اتحاد الکتاب العرب، دمشق، ستمبر ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۱- ۱۱۲۔

معمار کی ہے۔ کوئی چھلنی شریعت کی روشنی کو روک نہیں سکتی، آپ کی روشنی پاک اور روحانی ہے)۔

شام نژاد مہجری شاعر حسنی غراب، جس نے برازیل ہجرت کی اور جو اندلس لیگ کے بانیوں میں سے ہے، آنحضرت ﷺ کی تعریف وتوصیف میں قصیدہ پڑھتے ہوئے کہتا ہے[۱۲]:

شعلة الحق لم تــزل يا محمد منذ أضرمت نارهـا تتوقد
غمر الأرض نـورها فإذا رمت دليلاً فعد إلى الأرض واشهد
جئت والناس في ضلال وغي ومن الهدي في يديك مهنـد

(اے محمدؐ، حق کا شعلہ جب سے بھڑکا ہے، تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ زمین پر اس کی روشنی پھیل گئی ہے، لہٰذا اگر ثبوت چاہیے تو زمین کی طرف لوٹو اور خود دیکھو۔ آپ ایک ایسے وقت میں آئے جب لوگ گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے، اور آپ کے ہاتھ میں ہدایت کی ہندی[۱۳] تلوار تھی)۔

لبنانی عیسائی شاعر محبوب الخوری الشرتونی "قالوا تحب العرب" (انھوں نے کہا کہ آپ عربوں سے محبت کرتے ہیں) کے عنوان سے ایک نظم میں اعلان کرتا ہے کہ عرب ایک ہی نسلی گروہ اور قوم ہیں نیز ان کی مذہبی وابستگی سے قطع نظر وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس نظم میں وہ رسول اللہ ﷺ کو تمام بیابانوں کا ہیرو قرار دیتے ہوئے کہتا ہے[۱۴]:

قالوا تحب العرب قلت: أحبهم يقضي الجوار علي والأرحـامُ
قالوا: لقد بخلوا عليك، أجبتهم أهلي وإن شحــوا علي كـرام
قالوا: البداوةُ، قلتُ: أطهرُ عُنصرٍ صفت القلوبُ هناكَ والأجسامُ
ومُحَمَّد ... بطـل البرية كلــها هو للأعارب أجمعين إمـامُ

(لوگوں نے کہا کیا تو عربوں سے محبت رکھتا ہے؟ تو میں نے کہا کہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں کیونکہ ہمسایگی اور رشتے داری اس کو لازم قرار دیتے ہیں۔ لوگوں نے کہا: انھوں نے تو تیرے ساتھ بخل سے کام لیا ہے تو میں نے جواب دیا کہ وہ میری قوم ہیں لہٰذا میرے نزدیک عزیز و محترم ہیں خواہ وہ بخل کریں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ تو بدو ہیں تو میں نے کہا یہ

---

[۱۲] خفاجی، محمد عبد المنعم، قصۃ الادب المہجری، دار الکتاب اللبنانی، بیروت، ۱۹۸۶ء، ص ۷۲۵۔
[۱۳] ہندی تلوار (السیف المھنّد) قدیم عرب میں سب سے عمدہ تلوار سمجھی جاتی تھی۔
[۱۴] عفانی، سید حسین، وامحمد اہ ان شانئک ہو الابتر، دار عفانی، مصر، ۲۰۰۶ء، ج ۴، ص ۴۰۸۔

پاک ترین نسل کے لوگ ہیں جن کی روحیں اور جسم دونوں پاک ہیں۔ محمد تو تمام انسانیت کے ہیر وہیں اور وہ تمام عربوں کے رہبر ہیں)۔

مشہور مہجری[۱۵] شاعر الیاس فرحات بھی اپنی نعتیہ شاعری میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے عرب قوم کی بدحالی اور پسماندگی کی شکایت کرتا ہے۔ آپ ﷺ سے درخواست کرتا ہے کہ ہمیں اس دلدل سے نکال دیں جس میں ہم پوری طرح سے پھنس چکے ہیں۔ اپنی مشہور نظم "یارسول اللہ" (اے خدا کے رسول!) میں وہ رسول اللہ ﷺ کی مدح و ثنا کرتے ہوئے ان کو ایک ایسا چمکتا ہوا ستارہ قرار دیتا ہے جو جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں چمکا[۱۶]:

كوكب لم تدرك الشمس علوه	غمر الأرض بأنوار النبـوة
ترقب الدنيا ومن فيها دنـوه	لم يكد يلمع حتى أصبحت
زجها التضليل في أعمق هوة	يا رســـول الله إنا أمـة
لم يزل يظهر للشرق عتــوه	ذلك الجهل الذي حـاربته
إنما الدين هدى والعلم قـوة	قل لأتباعك صلوا وادرسوا

(ایک ستارے نے جس کی بلندی کو آفتاب بھی پہنچ نہ سکا زمین کو نبوت کی روشنی سے ڈھک لیا۔ ابھی وہ ستارہ چمکنے بھی نہ پایا تھا کہ دنیا اور دنیا والے آپ کے قرب ظہور کا انتظار کرنے لگے تھے۔ اے اللہ کے رسول! ہم ایسی قوم ہیں جسے گمراہی نے عمیق ترین گڑھے میں گرا دیا ہے۔ وہی جہالت جس سے اے رسول اللہ آپ نے جنگ کی تھی مشرق میں پھر اپنی سرکشی ظاہر کر رہی ہے۔ اپنے پیروؤں سے فرما دیجئے کہ تم عبادت کرو اور دین کا مطالعہ کرو کیونکہ دین سیدھا راستہ ہے اور علم ایک طاقت ہے)۔

مسیحی شعراء کی پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ سے محبت کے جھونکے آج تک ہمیں تازگی بخشتے رہے ہیں۔ لبنانی شاعر حلیم دموس بغیر کسی جانبداری کے ان سے محبت کے اعلیٰ ترین درجات پر پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کی تعریف و مدح کرتے ہوئے کہتا ہے[۱۷]:

مجدت في تعليمك الأديانا	أمُحَمَّد والمجد بعض صفاته

---

(۱۵) "مہجر" یعنی ہجرت کی جگہ - یہ ان عرب، بالخصوص شامی اور لبنانی، ادباء و شعراء کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اپنے وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں بالخصوص جنوبی امریکہ میں بس گئے لیکن انہوں نے عربی زبان سے اپنا تعلق برقرار رکھا اور ان میں بہت سے قابل ذکر ادباء و شعراء پیدا ہوئے۔ ایسے ادب کو "مہجری ادب" کہا جاتا ہے۔

(۱۶) د. مریدن، عزیزہ، الشعر القومي في المهجر الجنوبي، دار الفکر، ط ۲، ۱۹۷۳ء، ص ۳۵۹۔

(۱۷) ابو العیون، محمد، شعراء مسیحیون نظموا أروع القصائد في مدح النبي، صوت الازہر، ۲۴ نومبر ۲۰۱۷ء۔

إني مسيحي أحب محمداً وأراه في فلك العلا عنوانا

(اے محمد (ﷺ)، جس کے بعض اوصاف بزرگانہ ہیں، آپ نے اپنی تعلیم میں ادیان کی تعریف وستائش کی۔ بے شک میں ایک ایسا عیسائی ہوں جسے محمد (ﷺ) سے محبت ہے اور میں ان کو بلند آسمان میں ایک عنوان کے طور پر دیکھتا ہوں)۔

ریاض معلوف، جو برازیل میں مقیم لبنانی الأصل شاعروں میں سے ایک تھا، رسول اللہ ﷺ کی مدح وثنا میں رطب اللسان ہے[۱۸]:

يا نبي الأعراب والإسلام عيدك اليوم بهجة للأنام
أنت يا صاحب الرسالة فخر أنت أهل للمدح والإكرام
تنثر الحكمة البليغة شعراً عربيــاً يطيب للأفهام

(اے عربوں اور اسلام کے پیغمبر! آج تمہاری عید لوگوں کے لئے خوشی کا دن ہے۔
اے پیغام پہنچانے والے! آپ پر فخر ہے اور آپ مدح وثنا اور اکرام کے حق دار ہیں۔
آپ بلیغ حکمت کو عربی شاعری کے ذریعے پھیلاتے ہیں جو بآسانی سمجھ آجاتی ہے)۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ان عیسائی شعراء میں سے بعض شاعروں نے نہ صرف اسلامی تہذیب وثقافت کا احترام کیا بلکہ اس کی اعلیٰ انسانی اقدار اور بلند اخلاق وکردار سے متأثر ہو کر اسلام کو اپنا لیا۔ اللہ تعالی نے جب ان کو ہدایت بخشی تو انہوں نے اپنے مذہب کو خیر باد کہہ کے خالص یقین کے ساتھ اسلام قبول کر لیا، جیسے ابو الفضل الولید جو اسلام میں داخل ہونے سے پہلے الیاس طعمہ کے نام سے موسوم تھے۔ اسلام اور اس کی عظمتوں کے دفاع کے لیے انہوں نے ایک قصیدہ ابن الفارض کے مشہور قصیدہ کے طرز پر لکھا اور رسول اللہ ﷺ کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کی ایک بہترین مثال پیش کی[۱۹]:

أعاهد ربي أن أصلي مسلماً على أحمد المختار من خير أمة
هداني هواها ثم حب شرعه إليّ فصحت مثل حبي عقيدتي

(میں اپنے رب سے عہد کرتا ہوں کہ میں ایک مسلم کی حیثیت سے اس احمد پر درود بھیجوں گا جن کا انتخاب ایک بہترین امت میں سے ہوا ہے۔ ان کی محبت نے میری رہنمائی کی، پھر انہوں نے اپنی شریعت کو میرے لیے محبوب بنا دیا نیز میرا ایمان میری محبت کی طرح درست ہو گیا)۔

ایک اور مایۂ ناز لبنانی الأصل مہجری شاعر رشید ایوب ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ، خلفاء راشدین اور

---

[۱۸] عبد الدایم، صابر، أدب المهجر، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۷۵۔
[۱۹] د. مریدن، عزیزة، الشعر القومي في المهجر الجنوبي، دار الفكر، ط ۲، ۱۹۷۳ء، ص ۳۵۰ - ۳۵۱۔

بہادر فاتحین پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے[۲۰]:

نحن بني الأعراب كنا ولم نزل — بما خصنا المولى نفوق الأجانبا
من يا ترى أعلى الورى كمحمد — وأرفعهم مجدا وأسمى مناقبا
ومن مثل من قادوا الخلافة بعده — وكانوا لصرح العدل منه جوانبا
ألسنا الألى سادوا العباد ودوخوا — البلاد وأبدوا في الحروب عجائبا

(ہم عرب تھے، اور ہم آج بھی عرب ہی ہیں۔ کیونکہ رب نے ہمیں غیروں سے برتر قرار دیا ہے۔ بھلا محمد ﷺ کی طرح کس کا رتبہ بلند اور عظیم الشان ہے۔ ان کے بعد خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے والوں جیسا بھلا کون ہے جو عدل کی عظیم عمارت کے ستونوں کے مانند تھے۔ کیاہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے بندوں پر سرداری کی، ملکوں کو فتح کیااور جنگوں میں عجائبات دکھائے؟)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ بالا اشعار دراصل وہ اعتراف ہے جو عرب عیسائی شعراء نے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کی بے شمار خوبیوں کا احاطہ کرتے ہوئے کیا ہے۔ آپ ﷺ کی بردباری، رواداری، سچائی، چشم پوشی، منصفانہ رویہ اور کرم فرمائی ان کو بھی آپ کا قائل کر گئی۔ نیز جب بھی ذکر نبوی چھڑتا تو ان کے جذبات پر رقت طاری ہو جاتی اور وہ بھی بے قابو اور بے تاب ہو جاتے اور ان کی زبان سے ایسے کلام صادر ہوتے جو ان کی محبتوں اور شیفتگی کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے سوا اس قسم کی والہانہ محبت اور تعظیم انسانیت کی طویل تاریخ میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ اگر ان کا ذکر یا ان کا خیال ہی دل و زبان پر آجائے تو پوری کی پوری فضاء معطر ہو جاتی ہے۔ آپ ایسی باکمال ہستی ہیں جو سراپا تعریف و مدح ہے، جن کی ہر آن تعریف و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ ہر زمان و مکان میں انہی کی مدح کا چرچا ہوتا ہے۔ اپنے تو اپنے غیر بھی ان کے گرویدہ اور دام محبت میں اسیر نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے ایسے بے شمار پہلو ہیں جس نے ان عرب نژاد عیسائی شاعروں کو بھی فریفتہ کر دیا۔ بالخصوص آپؐ کی رواداری، صحابہ کرامؓ سے محبت و شفقت، آپ کا بلند اخلاق و کردار اور اہل کتاب اور مشرکوں کے ساتھ آپؐ کا حسن سلوک۔ آپ ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ اگر کوئی بھی شخص اخلاص نیت کے ساتھ مطالعہ کرے تو آپ کے اوصاف و کمالات اور محاسن و محامد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

---

[۲۰] د. سراج، نادرہ جمیل، شعراء الرابطہ القلمیہ، دار المعارف، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۳۔

موضوعاتِ شبلی کا پس منظر

پروفیسر خالد ندیم

شعبۂ اردو اور مشرقی زبانیں، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا (پاکستان)

dr.khalidnadeem@gmail.com

تاریخِ زبان و ادبِ اردو میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء- ۱۹۱۴ء) کی حیثیت ایک ایسے درخشندہ ستارے کی ہے جس کی کرنیں مسافرانِ علم و ادب کے لیے آج بھی مشعلِ راہ ہیں۔ علامہ شبلی اعظم گڑھ میں مولانا علی عباس چریا کوٹی، جونپور میں مولوی ہدایت اللہ خاں، غازی پور میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور مولوی فیض اللہ مئوی، رام پور میں مولانا ارشاد حسین رام پوری اور لاہور میں مولانا فیض الحسن سہانپوری جیسے نامور علما سے مستفید ہوئے، جب کہ تقریباً ایک مہینہ دارالعلوم دیوبند میں قیام کیا۔ انھوں نے ۱۸۷۶ء میں حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، باپ کی خواہش پر ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا، ۱۸۸۱ء میں کچھ عرصہ وکالت بھی کی، ۱۸۸۲ء میں بے روزگاری سے تنگ آکر نیل کے کارخانوں کی دیکھ بھال کی، ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۶ء تک علی گڑھ میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے سر سید احمد خاں کی سرپرستی و رفاقت میسر آئی، ۱۸۹۲ء میں استنبول، لبنان، شام اور مصر کی سیاحت کی، ۱۸۹۴ء سے ندوۃ العلما کی سرگرمیوں میں حصہ لیا، ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد دکن میں ملازمت کی، ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک دارالعلوم ندوہ کے معتمد رہے اور بالآخر اگست ۱۹۱۴ء میں بھائی مولوی محمد اسحاق کی اچانک وفات کے فوراً بعد اعظم گڑھ واپس آئے، دارالمصنّفین کی بنیاد رکھی اور یہیں پر پیوندِ خاک ہوئے۔ وہ ایک طرف اردو، عربی اور فارسی پر دسترس رکھتے تھے اور دوسری جانب مذہب، فقہ، علمِ کلام، شاعری، سفرنامہ، سوانح نگاری، مضمون نگاری، تنقید، تحقیق، سیرت، غرض ہر شعبۂ علم کے مردِ میدان تھے۔ یوں دیکھا جائے تو شبلی کی زندگی متنوع قسم کی مصروفیات اور مختلف النوع سرگرمیوں میں گزری۔ ایسے میں اگر ان کے تصنیفی موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو دلچسپ صورتِ حال سامنے آتی ہے۔

مختلف مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے اور مختلف علما سے مستفید ہونے کے بعد مولانا شبلی نے

غیر مقلدین کے ردّ کے لیے کمرِ ہمت چست باندھی۔ جب یہ سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد بن گیا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرے کا چیلنج دیتے۔ انھوں نے مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی[1]، چنانچہ ۱۸۷۷ء میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے ایک رسالے **امام الکلام فی مایتعلق بالقرأۃ خلف الامام** کے جواب میں شبلی نے عربی زبان میں چوبیس صفحات کا ایک مختصر رسالہ **اِسکات المعتدی علی اِنصات المقتدی** تحریر کیا جو دسمبر ۱۸۸۰ء میں مطبع نظامی کانپور سے چھپا۔ شبلی کی اس تحریر کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے جواب میں مولانا عبدالحی اور ان کے شاگردوں کی طرف سے چار رسالے چھاپے گئے۔ شبلی کے اس رسالے کی بازگشت ۱۸۹۲ء میں ان کے قیامِ استنبول کے دوران اس وقت بھی سنائی دی، جب ان کے میزبان شیخ عبدالفتاح کے یہاں ایک معروف صوفی شیخ علی ظبیان نے اس رسالے کو دیکھا اور کہا 'آہا! یہ رسالہ، مدت ہوئی، میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا تو انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا "شکر اللہ مساعیہ"۔ شبلی اس بات پر نہایت مسرور ہوئے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہِ قبول سے دیکھا۔[2] **اسکات** کے بعد ۱۸۸۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے چالیس صفحات پر مشتمل ان کی لکھی ہوئی **ظل الغمام فی مسئلہ القرأۃ خلف الامام** منظرِ عام پر آئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ جانے تک شبلی کی تصنیف و تالیف کا دائرہ مذہبی، بلکہ فقہی موشگافیوں تک محدود رہا۔

سنہ ۱۸۸۳ء میں شبلی علی گڑھ پہنچے تو ان کی زندگی نے دوسرا رُخ اختیار کیا۔ وہ قدیم طرزِ تعلیم سے مستفید ہوئے تھے، لیکن وہ اب جدید طرزِ تعلیم کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے تعلیمی ماحول میں ان میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ علی گڑھ تحریک کے فکری اثرات قبول کیے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ انھوں نے اسی احساس کے تحت ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ تحریک کی حمایت میں ایک مثنوی 'صبح امید' لکھی، جو ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد شبلی نے ایک مقالہ 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' لکھا، جو ۲۷/ دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے دوسرے اجلاس میں پڑھا گیا اور ۱۸۸۸ء میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ مضمون، جو

---

[1] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ: ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۰۔
[2] شبلی نعمانی: سفرنامۂ روم و مصر و شام، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ: ۲۰۱۰ء، ص ۳۳۔

ایک طرف تعلیم سے متعلق تھا تو دوسری جانب مسلم تاریخ سے بھی منسلک، شبلی کے تاریخی ذوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ شبلی کے تاریخی ذوق کا آغاز ان کے قیامِ لاہور کے دوران ہی میں ہو گیا تھا، جب انھوں نے ڈاکٹر لائٹنر کی کتاب **سنینِ اسلام** (مطبوعہ ۱۸۷۶ء) کا مطالعہ کیا تھا۔ مولانا اس کتاب میں مسلمان بادشاہوں کے حالات اور مسلمانوں کے علمی کمالات پڑھ پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے[۳]، البتہ ان کے اس ذوق کی اصل آبیاری علی گڑھ میں آکر ہوئی جب انھیں سرسید کے کتب خانے سے استفادے کا موقع ملا۔ سرسید نے اپنے کتب خانے کی نسبت انھیں عام اجازت دی ہوئی تھی اور ان کا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہتے اور کبھی تھک جاتے تو زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتے۔ سرسید نے شبلی کی یہ کیفیت دیکھی تو الماریوں کے سامنے کرسی رکھوادی۔ شبلی کے مطابق، سرسید کے پاس یورپ کی مطبوعہ تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں تھیں، جن کو ہندوستان کے بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔[۴] یہی وہ دور ہے جب شبلی نے تاریخِ اسلام لکھنے کا ارادہ کیا۔ کام کی وسعت کو دیکھتے ہوئے تاریخِ اسلام میں سے صرف بنی عباس تک محدود رہنے کا فیصلہ کیا، پھر ہر خاندان میں سے ایک ایک فرماں روا کے حالات و واقعات قلم بند کرنے کا ارادہ کیا، البتہ بعد میں اس میں بھی ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی اور شبلی نے نامورانِ اسلام پر کام شروع کر دیا، جس کے تحت **المامون**، **الفاروق** اور **سیرۃ النعمان** کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۸۷ء میں اوّل الذکر اور ۱۸۹۱ء میں آخر الذکر زیورِ طبع سے آراستہ ہو گئیں، البتہ **الفاروق** کو بوجوہ مؤخر کرنا پڑا۔ اسی عرصے میں فرماں روایانِ اسلام کے سلسلے میں ان کے مطالعے میں غیر مسلموں کے بعض اعتراضات آئے تو ان الزامات کے ردّ و ابطال میں **الجزیہ** کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا۔ قیامِ علی گڑھ میں شبلی نے ۱۸۹۲ء میں ممالکِ اسلامیہ کا سفر کیا، جن میں روم (استنبول)، شام اور مصر شامل تھے۔ اس سفر کی روداد انھوں نے **سفر نامۂ روم و مصر و شام** کے نام سے تحریر کی۔ یہ سفر نامہ اپنی تخلیق، ترتیب اور نتائج کے اعتبار سے شبلی اور علی گڑھ کے نقطۂ نظر کا بہترین امتزاج ہے۔

مثنوی 'صبح امید' کے بعد شبلی کی سخنوری جاری رہی اور متعدد اردو فارسی نظمیں معرضِ تحریر میں آئیں۔ ان میں سے ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۳ء کے دوران لکھی گئی سولہ فارسی نظموں پر مشتمل شبلی کا

---

[۳] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۱۳۴۔

[۴] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ: ۱۹۱۶ء، ص ۶۰۔

اوّلیں **مجموعۂ نظم** مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ ان نظموں کا زیادہ تعلق علی گڑھ، متعلقاتِ علی گڑھ اور روم و مصر و شام کے سفر سے ہے۔

علی گڑھ میں شبلی کا تیسرا اہم موضوع علمِ کلام رہا۔ ۱۸۹۲ء کے آس پاس شبلی تاریخ کے ساتھ ساتھ علمِ کلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ شبلی کے یہاں اس موضوع سے دلچسپی کا ابتدائی اظہار اس وقت ہوتا ہے جب وہ استنبول کے کتب خانوں سے استفادہ کر رہے تھے۔ سرسید کے نام ۸/ مئی ۱۸۹۲ء کے مکتوب میں شبلی نے استنبول میں نادر کتابوں کی موجودگی، امام غزالی کی کتب اور ان کے خطوط کی دستیابی کا ذکر کیا[۵] اور پھر ۲۵/ مئی ۱۸۹۲ء اور ۱۵/ جون ۱۸۹۲ء کے خطوں میں معتزلہ سے متعلق کتب کی عدم دستیابی کی بابت بتایا۔[۶] یہ باتیں سرسید کے بعض استفسارات کے جواب میں لکھی گئی ہوں گی یا خود اپنی دلچسپی سے، لیکن یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شبلی کو اس موضوع سے کہیں نہ کہیں مناسبت ضرور تھی۔ ۱۸۹۳ء میں سرسید نے انھیں **الغزالی** لکھنے کی فرمائش کی تھی،[۷] لیکن غالباً سرسید کے خیالات سے فکری اختلاف کے خدشے کے پیشِ نظر انھوں نے اس جانب کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن جیسے ہی شبلی علی گڑھ سے رخصت ہوئے، اس موضوع پر کام شروع کر دیا، البتہ اس کی تکمیل ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد جا کر ہوئی۔ **الغزالی** اپنے نام سے بظاہر ایک سوانح عمری محسوس ہوتی ہے، لیکن حقیقتاً یہ علمِ کلام کے سلسلے کی ابتدائی کڑی ہے۔ شبلی نے اس کے دیباچے میں علمِ کلام کو مسلمانوں کی خاص ایجاد اور مہتم بالشان علم قرار دیا اور بتایا کہ وہ علمِ کلام کی مبسوط تاریخ لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے خیال میں، انھوں نے امام غزالی کے حالات اور کارناموں کو قلم بند کرنا شروع کیا تو وہ اس قدر طویل ہو گیا کہ علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔[۸] اس کے بعد شبلی نے **علم الکلام** (۱۹۰۲ء) اور **الکلام** (۱۹۰۴ء) تصنیف کیں۔ علمِ کلام پر تصانیف کے اس سلسلے میں موجودہ ترتیب سے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

میں علما وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں، اس کے لیے زینے درکار ہیں۔ **الغزالی** پہلا زینہ ہے،

---

[۵] شبلی نعمانی: مکتوباتِ شبلی، مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ: ۲۰۱۲ء، ص ۳۲۔

[۶] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، ص ۱۳، ۱۴، ۱۵۔

[۷] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۲۹۵۔

[۸] ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: آثارِ شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ: ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۲۔

دوسرا زینہ علمِ کلام، پھر اصلی سطح، یعنی علمِ کلام جدید، جو زیرِ تصنیف ہے۔ غزالی میں اگر کھل کر کھیلتا تو علما برسوں، بلکہ قرنوں کے لیے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ ہو جانا منظور نہیں۔[۹]

یہ تصانیف بظاہر حیدرآباد میں قیام کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں، لیکن ان کا فکری رشتہ علی گڑھ سے ہے اور بالخصوص **الغزالی** کی فرمائش تو سر سید کر ہی چکے تھے، لیکن اُس وقت شبلی نے اس پر **الفاروق** کو ترجیح دی۔

اس نقطۂ نظر سے شاید انکار نہ کیا جاسکے کہ قیامِ علی گڑھ کے دوران شبلی ماضی، حال اور مستقبل میں جیتے رہے۔ ابتدائی برسوں میں وہ علی گڑھ کی آزادہ روی کے ساتھ ساتھ اعظم گڑھ کے مدرسوں کی فضا میں سانس لیتے ہیں، جس کی شہادت **سیرۃ النعمان** کی تالیف ہے، جب کہ دوسری جانب اُن کی نظر علی گڑھ سے بعض فکری اختلافات کے باعث مستقبل کے امکانات پر بھی رہی۔ سر سید دعا کیا کرتے تھے کہ مولوی شبلی **الفاروق** نہ لکھیں بلکہ وہ اصرار کرتے تھے کہ اپنا سفر نامہ ختم کرنے کے بعد وہ **الغزالی** لکھ دیں[۱۰]، مگر جب اپریل ۱۸۹۴ء میں کانپور میں ندوۃ العلما کا قیام عمل میں آیا تو شبلی کو اپنی خواہشات کی تکمیل نظر آئی۔ چنانچہ انھوں نے اس صدا پر نہ صرف یہ کہ لبیک کہا، بلکہ اس وقت سے وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا[۱۱]۔ دیکھا جا سکتا ہے کہ زندگی کے آخری برسوں تک شبلی کسی نہ کسی بہانے اس ادارے سے منسلک رہے۔ علی گڑھ کے ساتھ ساتھ ندوہ کی سرگرمیوں میں شبلی کا عمل دخل بڑھا تو خیالات میں تبدیلی رونما ہونا ناگزیر تھا۔ اب وہ منصوبے، جو محض علی گڑھ اور سر سید سے تعلق کی بِنا پر معرضِ التوا میں پڑے تھے، ان کے روبعمل لانے کا وقت آ گیا، چنانچہ اگست ۱۸۹۴ء میں انھوں نے **الفاروق** لکھنے کا ارادہ کر لیا[۱۲]۔ چار سال میں یہ تالیف مکمل ہوئی اور سر سید کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

حیدرآباد دکن سے اپریل ۱۹۰۱ء میں ریاست کے امورِ مذہبی کے شعبے میں مددگار معتمد کے

---

[۹] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، ص ۱۵۰۔
[۱۰] سر سید احمد خاں: علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، ۱۰؍ مارچ ۱۸۹۳ء۔
[۱۱] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۲۴۳۔
[۱۲] شبلی نعمانی: الفاروق، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۔

عہدے کی پیش کش ہوئی تو شبلی نے معذرت کی، البتہ بعد میں انھیں سر رشتہ علوم وفنون کی نظامت پیش کی گئی تو شبلی نے اسے منظور کر لیا اور ۲۲؍ مئی ۱۹۰۱ء کو اس منصب پر فائز ہو گئے۔ یہی وہ دور ہے جب شبلی کے تصنیفی موضوعات کا رُخ بتدریج شعر و ادب کی طرف ہو گیا۔ ایک تو نواب مرزا داغ اور امیر مینائی کی موجودگی کے باعث حیدرآباد کی پر رونق ادبی فضا، اس پر انجمن ترقی اردو کی نظامت، شبلی کے ادبی ذوق کی آبیاری کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ ۷؍ نومبر ۱۹۰۳ء کو مولوی محمد سمیع کے نام خط میں میر انیس کے کلام پر ایک مفصل ریویو لکھنے اور بعد میں اس کی کتابی صورت میں اشاعت کے ارادے کی اطلاع دی[۱۳]۔ یہاں ان کی تالیف **الکلام** شائع ہوئی تو معتمد کی طرف سے دیباچے میں مطلع کیا گیا کہ **الکلام** اس سلسلۂ آصفیہ کی نویں جلد ہے اور دسویں **موازنۂ انیس و دبیر** اور گیارہویں **سوانح عمری مولانا روم**۔[۱۴]

حسبِ سابق، حیدرآباد کے تمام خواب قیامِ حیدرآباد (۱۹۰۱ء-۱۹۰۵ء) میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے، چنانچہ اوّل تو مذکورہ ترتیب الٹ ہو گئی اور مزید یہ کہ **سوانح عمری** حیدرآباد سے رخصتی کے بعد ۱۹۰۶ء میں اور **موازنہ** ۱۹۰۷ء میں مکمل ہو کر زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔

حیدرآباد کے زمانۂ قیام نے شبلی کی تنقیدی صلاحیتوں کو بہت جلا بخشی چنانچہ **سوانح عمری** اور **موازنہ** کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری اور اس کی تاریخ پر بھی اُن کی نظر رہی۔ فارسی شاعری کی تاریخ (**شعر العجم**) کی طرف شبلی کی ابتدائی توجہ اس وقت سے معلوم ہوتی ہے جب انھوں نے مئی ۱۸۹۴ء میں اپنے دوست پروفیسر آرنلڈ کی اطلاع پر جرمن پروفیسر جیمس ڈار مسٹیٹر کی فرانسیسی ۸۸؍ صفحات پر مشتمل ایک مختصر کتاب منگوائی[۱۵]۔ اس کے بعد ۱۰؍ جولائی ۱۸۹۹ء کو حبیب الرحمن خاں شروانی کو ایک خط میں اس موضوع پر لکھنے کی ترغیب دی، معاونت کا وعدہ کیا اور موادِ تحریر، عنواناتِ مضامین وغیرہ سب سامان مہیا کرنے کا یقین دلایا[۱۶]۔ چونکہ ان دنوں شبلی کے پاس فارسی کا ایک بھی دیوان موجود نہ تھا، چنانچہ ۲۶؍ جولائی ۱۸۹۹ء کے خط میں مطلع کیا کہ انھیں (شبلی کو)

---

[۱۳] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۱۶ء، ص ۱۱۲۔
[۱۴] بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۳۰۵۔
[۱۵] شبلی نعمانی: شعر العجم اوّل: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۔
[۱۶] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، ص ۱۲۳۔

صرف عالمِ خیال سے کام لینا پڑے گا[۱۷]۔ اسی خط میں شبلی نے شروانی کو اس منصوبے کا خاکہ بھی پیش کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت تک شبلی اپنے موضوع سے متعلق خوب غور و فکر کر چکے تھے۔ اگر چہ ۲/ مئی ۱۹۰۲ء کو مہدی افادی کو آگاہ کیا کہ فارسی شاعری کی باری دو ایک برس کے بعد آئے گی[۱۸]، لیکن عملاً اس کا آغاز حیدرآباد سے رخصتی کے بعد ۶/ مارچ ۱۹۰۶ء کو ہوا، بیچ بیچ میں **موازنہ** اور **الندوہ** سدّراہ رہے۔ **موازنہ** سے فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوئے، یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دورِ اوّل کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا[۱۹] اور ۱۹۰۸ء میں مطبع فیض عام علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہو گیا۔

سنہ ۱۹۰۶ء اور اس کے بعد سیاحت اور اقامت کی غرض سے شبلی کا متعدد مرتبہ بمبئی جانا ہوا۔ ان اسفار اور وہاں کے شب و روز نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے، جن کا اظہار ان کے خطوط اور فارسی شاعری میں ہوا ہے۔ ۲/ اگست ۱۹۰۶ء کو سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ یہاں کا موسم نہایت خوش گوار ہے، قدرت اور مقدوریت ہوتی تو یہیں کا ہو جاتا[۲۰]، ۱۰/ اگست ۱۹۰۶ء کو مہدی افادی کو بتاتے ہیں کہ یہاں کا موسم آج کل اس قدر فرحت انگیز ہے کہ وہاں (ہندوستان) سے اندازہ بھی نہیں ہو سکتا،[۲۱] ۱۱/ ستمبر ۱۹۰۶ء کو انھیں کو مطلع کرتے ہیں کہ انیس برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کر سکتا،[۲۲] ۲۶/ فروری ۱۹۰۸ء کو حبیب الرحمن خاں شروانی کو آگاہ کرتے ہیں کہ اب کے بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں، آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے[۲۳] اور ۲/ مارچ ۱۹۰۸ء کو مہدی افادی کو تحریر کرتے ہیں کہ بمبئی میں بڑی دلچسپیاں رہیں جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں۔ بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں جو

---

[۱۷] ماخذ سابق، ص ۱۲۵۔

[۱۸] ماخذ سابق، ص ۲۳۰۔

[۱۹] شبلی نعمانی: شعر العجم اوّل، ص ۱۵۔

[۲۰] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۷۔

[۲۱] ماخذ سابق، ص ۲۳۷۔

[۲۲] ماخذ سابق۔

[۲۳] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، ص ۱۷۹۔

شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں[۲۴]۔

بمبئی کی ان صحبتوں کے اثرات اُن غزلوں میں بخوبی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں، جو ۱۹۰۸ء میں **دستۂ گل** کے نام سے قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہونے والے مجموعہ کلام میں شامل ہیں۔ شبلی کے نام اپنے خط میں حالی نے لکھا تھا کہ 'کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے، جس نے **سیرۃ النعمان**، **الفاروق** اور **سوانح عمری مولانا روم** جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں'۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی و بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل رُبائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں[۲۵]۔ ۱۹۰۸ء ہی میں فارسی کلام کا مجموعہ **بوئے گل** کے نام مطبع احمدی علی گڑھ سے شائع ہوا، لیکن اس میں جذب و کیف کی وہ کیفیت نہ تھی، جو **دستۂ گل** کی انفرادیت ہے۔ مہدی افادی کے نام ۸/ مئی ۱۹۰۹ء کے خط میں شبلی نے اعتراف کیا تھا کہ واقعی دونوں کے شانِ نزول اسی قدر مختلف ہیں، جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے۔[۲۶]

بمبئی سے واپسی پر غالباً نومبر ۱۹۰۶ء میں شبلی نے اپنے شاگرد محمد علی جوہر کی دعوت پر بڑودہ میں قیام کیا اور بعد ازاں ان کی تحریک پر ایک سلسلۂ مضامین میں اورنگ زیب عالمگیر پر وارد الزامات کا جواب لکھنا شروع کیا۔ ان مضامین کی اشاعت دسمبر ۱۹۰۶ء سے مارچ ۱۹۰۸ء تک جاری رہی اور ۱۹۰۹ء میں انھیں **اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر** کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔

ندوہ سے شبلی کا تعلق ۱۸۹۴ء کو استوار ہوا تو نشیب و فراز کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری برس تک قائم رہا۔ ندوہ سے شبلی کے تعلق کو قدیم مدرسوں اور علی گڑھ جیسے جدید تعلیمی ادارے کا ردّ عمل قرار دیا جائے تو شاید کچھ غلط نہ ہو گا۔ ایک طرف شبلی قدیم مدرسوں کی فرقہ وارانہ کتب و رسائل سے نالاں ہو چکے تھے تو دوسری جانب وہ مستشرقین کی تحقیقات سے بھی مطمئن نہ تھے۔ اگرچہ ابتدائی مذہبی تصانیف کے بعد شبلی کبھی شعر و سخن کے طرف گئے، کبھی تاریخ کے میدان میں سرگرم رہے، کبھی سوانح عمریاں لکھنے لگے اور کبھی علمِ کلام سے دلچسپی ظاہر کی، لیکن ان کی

---

[۲۴] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۴۵۔

[۲۵] ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (مرتب): علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء، ص ۴۶۔

[۲۶] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی دوم، ص ۲۵۲۔

تصانیف کا تعلق بالعموم اسلام اور مسلمانوں سے رہا۔ مشرق و مغرب کے علم و ادب سے ان کی بے اطمینانی نے انھیں عقل و عشق کے امتزاج سے ایک نئے رنگِ تحقیق کی راہ دِکھائی۔ مذکورہ بالا تصانیف و تالیفات کے اندازِ تحریر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تخلیق، تنقید اور تحقیق سے ہوتے ہوئے شبلی اُس مقام تک پہنچ چکے تھے، جہاں وہ جذبہ و فکر پر مشتمل کسی معیاری تحقیقی کام کا آغاز کر سکتے تھے۔ یہی وہ موقع تھا، جب وہ اپنی زندگی کا آخری معرکہ سر کرنے کو تیار ہوئے اور زندگی بھر کے مجاہدے کے ثمرات سمیٹنے کے لیے **سیرۃ النبی** لکھنے کا ارادہ باندھنے لگے۔

حضور نبی کریمؐ سے متعلق اُن کی تصنیفی وابستگی کا آغاز ۱۸۷۶ء میں اُس وقت ہوتا ہے، جب وہ حج بیت اللہ کے لیے حجازِ مقدس پہنچتے ہیں اور روضۂ رسول کی زیارت کرتے ہیں اور یہ اشعار کہتے ہیں:

اے بہ کرم کار جہاں کرد ساز
مر ہمہ را پیشِ تو روے نیاز
چو بہ درت آمدہ ام با امید
از کرم خویشتن مکن نا امید
چوں بہ درت آمدم امیدوار
سایۂ لطفے ز سرم برمدار[۲۷]

آغازِ شباب کی ایک اور نعت کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے:

یا سائلی عن ذالخبر، رحمے کہ امروزم دگر
از دیدہ شد خونِ جگر، و ز دُود آہِ بی اثر
آید جہانم در نظر از بخت خود ہم از تیرہ تر
تا کی تواں کردن بسر، آتش زدہ در جان و تن[۲۸]

علی گڑھ میں سرسید کی فرمائش پر تدریسی ضرورت کے تحت شبلی نے عربی زبان میں چون (۵۴) صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ **تاریخ بدء الاسلام** تحریر کیا، جو اپنے موضوع کے اعتبار

---

[۲۷] شبلی نعمانی: کلیاتِ شبلی فارسی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۰۔
[۲۸] شبلی نعمانی: کلیاتِ شبلی فارسی، ص ۹۶۔

سے سیرت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۹۱ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا اور اس کی اہمیت کے پیش نظر بعد ازاں اس کا فارسی ترجمہ مولانا حمید الدین فراہی اور اردو ترجمہ محمد حمید اللہ نے کیا۔

شبلی نے حیدرآباد کے قیام میں سیرت النبیؐ پر لکھنے کا آغاز کیا اور ۲۷ر مئی ۱۹۰۳ء کو مولوی حسین عطاء اللہ حیدرآبادی کو جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری لکھنے کے متعلق مطلع کیا۔[۲۹] سید سلیمان ندوی نے اطلاع دی ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہی، صرف [تین] ہجری تک لکھ کر چھوڑ دیا تھا [اور یہ کہ] وہ ناتمام مسودہ دارالمصنّفین میں موجود ہے[۳۰]، گویا سیرت پر لکھنے کی ابتدا حیدرآباد میں ہوگئی تھی، لیکن وسائل کی کمی، مصادر و منابع کے فقدان اور تحقیقی طریقِ کار سے متعلق عدم اطمینان کے باعث وہ اس کام کو جاری نہ رکھ سکے۔

سیرت لکھنے سے متعلق شبلی کی توجہ کی ایک نشاندہی محمد علی جوہر نے سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں کی ہے:

> ۱۹۰۶ء میں مولانا واستاذنا شبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے اور میرے ہی پاس مقیم تھے۔ اس زمانہ میں، میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمایئے کہ سیرۃ النبی کا کیوں انتظام نہیں فرماتے۔ ہندوستان میں کون ہے، جو کفار کے پے درپے، مگر بیجا سے بیجا حملوں کا جواب دے گا۔ نہ معلوم، اس سے قبل مولانا مرحوم کو کتنی بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہو گا، مگر طرزِ گفتگو سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر نے اثر کیا اور آخری فیصلہ کم سے کم بڑودہ ہی میں رہ کر کیا گیا۔[۳۱]

اس بیان کو اگر پوری حقیقت نہ بھی کہا جائے تو مہمیز ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ سیرت سے متعلق باقاعدہ اعلان (۱۹۱۲ء) سے پہلے ہی شبلی کر چکے تھے، جیسا کہ پروفیسر عبدالقادر کے نام جون ۱۹۱۱ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> سیرتِ نبوی، جو زیرِ تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنّفین نے جو کچھ آنحضرتؐ کے متعلق لکھا ہے، اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے، تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب

---

[۲۹] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۳۲۶۔

[۳۰] ماخذ سابق۔

[۳۱] بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۵۴۰۔

موقع حجت اسلامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بد دیانتیاں کی ہیں، نہایت زور و قوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔[۳۲]

با قاعدہ اعلان ''الندوہ'' کے شمارے جنوری ۱۹۱۲ء میں کر دیا گیا اور جون ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں تالیف کا آغاز ہو گیا؛ گویا شبلی کی زندگی بھر کی تصنیفی و تحقیقی ریاضتوں اور کاوشوں کا ثمر **سیرت النبیؐ** کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ **سیرت النبیؐ** کی تالیف کے لیے شبلی نے زندگی بھر علمی، تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی سفر کیا اور بالآخر سیرت کی منزل حاصل کر لی۔

....

مذکورہ بالا مباحث کے بعد یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ اعظم گڑھ کی فضا میں شبلی پر مسلکی رنگ غالب تھا۔ علی گڑھ تحریک سے منسلک ہوئے تو ان کی نظم و نثر کا رُخ قومی معاملات کی طرف مڑ گیا اور تاریخ و علمِ کلام سے متعلق تصانیف منظر عام پر آئیں۔ ندوہ سے وابستگی نے انھیں قدیم و جدید تعلیم سے ایک قدم آگے بڑھا دیا۔ حیدرآباد کی علمی و ادبی ماحول میں رہ کر وہ اردو فارسی شعر و ادب کی تنقید پر وہ کچھ لکھ گئے کہ آج شبلی کی ادبی حیات کی ایک بڑی وجہ یہی تصانیف قرار دی جاسکتی ہیں، جب کہ بمبئی کے شب و روز نے ان کی شاعری کو ایک نئی جہت اور جوش و ولولہ عطا کیا۔ یہ ساری گفتگو بیکار تھی اگر ان تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں ان کی مؤلفہ سیرت منصہ شہود پر نہ آتی۔ اگرچہ اس تالیف کا کسی ادارے، کسی علاقے، کسی دور سے تعلق قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ابتدائی دور میں مدارس میں زیرِ تعلیم رہنے، علی گڑھ میں سرسید کے بعض مغرب زدہ افکار سے اختلاف کرنے اور ندوۃ العلما میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کا ذہنی ارتقا انھیں اس مقام پر لے آیا تھا جہاں اگر وہ سیرت نگاری کی طرف توجہ نہ دیتے تو زندگی بھر کی ریاضت رایگاں جاتی:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ
خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا[۳۳]

---

[۳۲] شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۱۶ء، ص ۲۳۷-۲۳۸۔

[۳۳] شبلی نعمانی: کلیاتِ شبلی اردو، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۲۔

کتابیات:

سر سید احمد خاں: علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، ۱۰؍مارچ ۱۸۹۳ء

سلیمان ندوی، سید: حیاتِ شبلی: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء۔

شبلی نعمانی: الفاروق: دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۹۱ء۔

شبلی نعمانی: سفر نامۂ روم و مصر و شام: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء۔

شبلی نعمانی: شعر العجم اوّل: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء۔

شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔

شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۱۶ء۔

شبلی نعمانی: مکاتیبِ شبلی دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی: دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۱۶ء۔

شبلی نعمانی: مکتوباتِ شبلی، مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء۔

شبلی نعمانی: کلیاتِ شبلی اردو: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء۔

شبلی نعمانی: کلیاتِ شبلی فارسی: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء۔

محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر: آثارِ شبلی: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء۔

محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر (مرتب): علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء۔

تحریکِ ریشمی رومال میں مولانا عبدالرحیم رائے پوری کا کردار

بدر عالم

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

badar.alam11@gmail.com

مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی ولادت ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں موضع ''تگِری'' میں ہوئی[۱]۔ تگری اُس وقت تحصیل ''تھانیسر''، ضلع ''کرنال''، صوبہ ''پنجاب'' کا حصّہ تھا اور موجودہ جغرافیہ میں تحصیل ''جگادھری''، ضلع ''یمنانگر''، صوبہ ''ہریانہ'' کا حصہ ہے۔ سنہ ۱۲۹۱ھ /۱۸۷۴ء میں انھوں نے مظاہرِ علوم سہارنپور سے درسِ نظامی کی تکمیل کی[۲]۔ انھوں نے شیخ میاں عبدالرحیم سرساوی ثم سہارنپوری (م۱۳۰۳ھ /۱۸۸۵ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۹۰۵-۱۸۲۶ء) سے تصوف و سلوک میں کسبِ فیض کیا اور دونوں مشائخ سے مختلف سلسلوں میں خرقۂ خلافت حاصل ہوا[۳]۔ مولانا گنگوہی سے قبل حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی (۱۸۹۹-۱۸۱۸ء) سے بھی بیعت وارادت کا تعلق رہا اور اُن سے بھی مجازِ بیعت ہوئے[۴]۔ آپ نے پہلے شیخ میاں عبد الرحیم سہارنپوری کی ہدایت پر ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں ''رائے پور'' میں مستقل سکونت اختیار کی۔ رائے پور میں انھوں نے

---

[۱] ندوی، مسعود عزیزی، مفتی، تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، رائے پور (ضلع سہارنپور، اترپردیش)، شعبۂ نشرواشاعت مدرسہ فیضِ ہدایت در گلزارِ رحیمی خانقاہ رائے پور، ۱۴۳۳ھ / ۲۰۱۲ء، ص ۴۳

[۲] آزاد، عبدالخالق، مفتی، سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، رحیمیہ مطبوعات، دہلی، ۲۰۲۱ء، طبعِ سوم، ص ۹۴

[۳] ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، ، مکتبہ اسلام، لکھنؤ ۲۰۱۲ء، ساتواں ایڈیشن، ص ۳۲۱، حاشیہ / (الحسینی، سید نفیس، شعر الفراق، سید احمد شہید اکادمی لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۷۸)

[۴] فیوض الرحمٰن، حافظ، قاری، ڈاکٹر، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی اور اُن کے خلفاء، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸۹ تا ۱۹۳

مسجد، مدرسہ اور خانقاہ قائم کرکے ایک علمی اور تعلیمی و تربیتی مرکز قائم کیا۔ رائے پور کے اِس مرکز کو ''خانقاہِ رحیمی رائے پور'' کے نام سے شہرت حاصل ہوئی[۵]۔ اُن کی وفات ۲۵؍ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ / ۲۸؍ جنوری ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور رائے پور میں سپردِ خاک ہوئے[۶]۔ اُن کے جانشین اُن کے شاگردِ رشید مولانا عبدالقادر رائے پوری (۱۸۷۴-۱۹۶۲ء) ہوئے جو اپنے عہد کے مشہور شیخِ طریقت اور مصلح و مربی تھے۔

جہد و کردار: مولانا عبدالرحیم رائے پوری نے مختلف میدانوں میں خدمات انجام دی ہیں۔ انفرادی تزکیہ و تربیت، حصولِ آزادی، دینی تعلیم کی اشاعت، اصلاحِ عقائد و اعمال اور رسوم و بدعات کا ازالہ اُن کی جدوجہد کے نمایاں میدان رہے ہیں۔

اپنے عہد میں قومی سیاست اور تحریکِ آزادی میں بھی انھوں نے بھرپور حصّہ لیا۔ جدوجہدِ آزادی میں اُن کا کردار تحریکِ ریشمی رومال کے حوالے سے زیادہ نمایاں ہے۔ اِس تحریک کے ایک اہم رازدان، قائد و سرپرست اور ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے انھوں نے جس طرح سرپرستانہ جدوجہد کی، اسی طرح ضروری تقاضوں کے پیشِ نظر عملی جدوجہد میں بھی حصّہ لیا۔

سرپرستانہ جہد و کردار: مولانا رشید احمد گنگوہی، جن کے بڑے خلفاء میں مولانا رائے پوری بھی تھے، کی وفات کے بعد مولانا رائے پوری کو جماعت کے بزرگ سرپرست کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنے رفقاء اور معاصرین کے درمیان اُن کی رائے ایک وزن رکھتی تھی اور ہر اہم معاملے میں اُن سے مشاورت کی جاتی تھی۔ اپنے شیخ کی وفات کے بعد وہ اپنے مشائخ و اسلاف سے متعلق اداروں اور جماعتوں اور تحریکوں کے حوالے سے سرپرستانہ اور مربّیانہ کردار ادا کر رہے تھے۔ چناں چہ انھوں نے تحریکِ ریشمی رومال میں بھی سرپرستانہ کردار ادا کیا۔

بہت سے مکاتب و مدارس اور اداروں و تحریکوں کی طرح اُن کے وقیع اور دور رس مشورے تحریکِ ریشمی رومال کے قائدین میں قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ تحریک کے قائدِ اعلیٰ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۸۵۱ء-۱۹۲۰ء) جس طرح اُن

---

[۵] الحسینی، سید نفیس، شعر الفراق، سید احمد شہید اکادیمی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۷۶-۷۷

[۶] میرٹھی، عاشق الٰہی، مولانا، تذکرۃ الخلیل، سہارنپور، مکتبہ خلیلیہ، ۱۹۹۱ء، طبعِ دوم، ص ۲۶۵-۲۶۶

کا بڑا احترام اور اُن پر آخری درجہ کا اعتماد کرتے تھے، اسی طرح اُن کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے تھے[۷]۔ چناں چہ تحریک کی اعلیٰ قیادت، بشمول شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری (۱۸۵۲ء-۱۹۲۷ء) وغیرہ، رائے پور میں جمع ہوتی تھی جو اُس وقت کے سیاسی ہنگامے میں اپنے آبادیاتی اور جغرافیائی حالات کے لحاظ سے موزوں تھا اور مولانا رائے پوری کی خانقاہ میں باہمی مشاورت، فیصلہ سازی اور منصوبہ بندی کیا کرتے تھے[۸]۔ تحریک کے اہم امور میں جو مشاورت ہوتی، جو اہم فیصلے کیے جاتے اور جو حضرات منصوبہ بندی اور فیصلہ سازی کرتے، اُن میں ایک اہم نام مولانا رائے پوری کا ہے۔

مولانا رائے پوری کی وفات پر شیخ الہند نے، جو اُس وقت مالٹا میں اسیر تھے، انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جو طویل مرثیہ لکھا اور جو مسدسِ مالٹا کے نام سے شائع ہوا، اُس میں بھی اُن کی رائے اور مشورے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ اشعار تحریر کیے ہیں:

ہمدمو! رائے کس سے لوگے، کہو
مشورے کس سے اب کروگے، کہو
رازِ دل کس سے اب کہوگے، کہو
رائے پور بھی کبھی چلوگے، کہو
زینت و زیبِ الفِ ثانی مُرد
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد[۹]

---

[۷] الحسینی، سید نفیس، شعر الفراق، ، سید احمد شہید اکادیمی لاہور ، ۱۹۷۸ء، ص ۸۲ / رائے پوری، حبیب الرحمن، ارشادات قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، کتب خانہ اختری، سہارنپور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲

[۸] آزاد، عبدالخالق، سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، رحیمیہ مطبوعات، دہلی ، ۲۰۲۱ء، طبعِ سوم، ص ۲۴۹

[۹] دیوبندی، محمود حسن، شیخ الہند، مسدس مالٹا، (ماہنامہ القاسم) دیوبند، رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ، بعنوان ''ترجیع بند در مرثیۂ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدّس سرّہ''، مرتب محمد اعزاز علی، ص ۸ / حاشیہ: اس مرثیے سے قبل اعزاز علی کی مندرجہ بالا تحریر درج ہے: ''یہ مسدس قطب العالم حضرت مولانا الحاج المولوی محمود حسن صاحب متعنا اللہ بطول حیاتہ نے مالٹا میں اپنی نظر بندی کے زمانہ میں حضرت شیخ المشائخ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرّہ

افرادی قوت کی فراہمی اور مالی امداد کی ترسیل: سرپرستانہ جدوجہد کے ساتھ مولانا رائے پوری نے تحریکِ ریشمی رومال میں عملی جدوجہد کا بھی ساتھ دیا۔ تحریک کو افرادی طاقت اور مالی امداد کی فراہمی میں انھوں نے بھرپور حصّہ لیا۔ صوبہ جات متحدہ، پنجاب اور ریاستِ بہاول پور کے وسیع خطّے اور اِن کے نواحی علاقوں میں اُن کا وسیع حلقۂ اثر تھا۔ اپنے حلقۂ اثر میں ایک جانب انھوں نے تحریک کے قائد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا اعتماد قائم کیا تاکہ طے شدہ منصوبے کے مطابق جیسے ہی اُن کی جانب سے اعلانِ جنگ ہو، لوگ بغاوت و انقلاب اور حریت و آزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ دوسری جانب انھوں نے معتمد احباب و رفقاء کے ذریعے چندہ اکٹھا کر کے خفیہ طریقے سے تحریک کے متعلقہ کارکنان تک پہنچایا[۱۰]۔ تاکہ وہ مقاصد و عزائم بروئے کار لائے جائیں جن کا تحریک کے ایک رازدار کی حیثیت سے انھیں علم رہتا تھا۔

پنجاب کی سی آئی ڈی پولیس نے تحریک کے کارکنان کا جو ریکارڈ تیار کیا تھا اور بعد میں جس کا اردو ترجمہ "ریشمی خطوط کے کیس میں کون کیا ہے" کے عنوان سے ہوا، اس میں بھی تحریک کے لیے مولانا رائے پوری کے اِس کردار کا ذکر ملتا ہے کہ وہ شیخ الہند کی جہاد کی اسکیم میں شریک تھے، دیوبند کے مدرسے کی کمیٹی میں شامل تھے اور شیخ الہند کی عدمِ موجودگی میں اُن کے نائب کے طور پر روپیہ جمع کرنا اور اسے تحریک کے ناظمِ مالیات مولوی حمد اللہ پانی پتی کو پہنچانا اُن کی ذمہ داری تھی[۱۱]۔

انگریز فوج کی خفیہ معلومات سے واقفیت کا طریقہ: تحریک میں مولانا رائے پوری کا عملی کردار اِس لحاظ سے منفرد تھا کہ انھوں نے خفیہ طور پر کسی نہ کسی شکل میں انگریزوں کے فوجی مراکز اور راستوں، اور اُن کی نقل و حرکت اور خفیہ منصوبوں سے واقفیت کی راہ نکال رکھی تھی تاکہ اُن کی فوجی معلومات اور اُن کی نقل و حرکت معلوم ہوتی رہے اور انقلاب اور جنگ کے اعلان کے موقع پر اُن کے ٹھکانوں کو نشانہ بھی بنایا جائے۔

اس کی شکل اس طرح پیدا ہوئی کہ اُن کے ایک معتمد مرید مستری احمد حسن مسوری

کی وفات سے متأثر ہو کر تحریر فرمایا تھا۔ ہندوستان میں تشریف آوری کے بعد ہم کو ایک دوست کے ذریعہ سے مل گیا، اس لیے ذی علم حضرات کی خدمت میں بطور نادر تحفہ کے پیش کیا جاتا ہے"

[۱۰] تحریکِ شیخ الہند، ریشمی خطوط سازش کیس، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۷۵، ص ۳۶۴

[۱۱] تحریکِ شیخ الہند، ریشمی خطوط سازش کیس، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۷۵، ص ۳۶۴

(دہرادون، اتراکھنڈ) میں واقع انگریزوں کے فوجی سروے آفس میں ملازم تھے جہاں انگریز حکومت کے نقشے تیار ہوتے تھے۔ مستری احمد حسن پر انگریز افسروں کا اس حد تک اعتماد تھا کہ وہ اتوار کو چھٹی کے روز دفتر کی چابیاں اُن کے سپرد کر جاتے تھے۔ مستری احمد حسن خفیہ طور پر نقشے لے کر خانقاہ رائے پور پہنچ جاتے اور وہ نقشے اور دستاویزات مولانا کو دکھاتے اور پھر نقشوں کو واپس آفس میں رکھ دیتے۔ مولانا رات کی تنہائی میں اُن نقشوں کو ملاحظہ کرتے اور حسّاس ٹھکانوں کی معلومات حاصل کرتے تھے[۱۲]۔ مولانا تحریک کے مراکز اور اُن کے راستوں سے واقفیت کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے تاکہ مالی امداد کی فراہمی جسے وہ از خود انجام دیتے تھے اور ہدایت و پیغام کی ترسیل آسان ہو[۱۳]۔

انگریز اقتدار کے خلاف بیعت: تحریکِ ریشمی رومال کا مقصد انگریز اقتدار کے خلاف انقلاب لانا تھا اور وہ اِس مقصد کے لیے خفیہ طور پر کام کر رہی تھی۔ اُس کے طریقہ کار کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اُس کے چنندہ قائدین و رہبران انگریز اقتدار کے خاتمے کے لیے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں معتمد افراد و کارکنان سے خفیہ طور پر بیعتِ جہاد لیتے تھے تاکہ جیسے ہی آزادی کی جنگ اور انقلاب کا اعلان ہو، بیعت کے ذریعہ عہدِ جہاد کرنے والے افراد انگریز اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اُس میں حصّہ لیں۔ اُن بیعتِ جہاد لینے والوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے ساتھ مولانا رائے پوری کا اسمِ گرامی شامل تھا۔ مولانا رائے پوری نے اپنے تلمیذ رشید مولانا عبدالقادر رائے پوری کو اپنے مرضِ وفات میں ہدایت کی تھی کہ وہ اُن کی جانب سے بھی اور اپنی جانب سے بھی مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے بیعتِ جہاد کریں۔ اِس واقعہ کو مولانا عبدالقادر نے بیان کیا ہے[۱۴]۔

چوں کہ یہ مولانا رائے پوری کا آخری زمانۂ حیات تھا، لہٰذا اُن کی یہ ہدایت اِس معنی میں تھی کہ تحریکِ ریشمی رومال کے پلیٹ فارم سے حریت و آزادی کی جو جد و جہد ہو رہی ہے، وہ اُن کے بعد بھی جاری رہے اور اُن کے متعلقین اگلے دور میں بھی اسے جاری رکھیں۔

---

(۱۲) الحسینی، سید نفیس، ''شعر الفراق''، سید احمد شہید اکادیمی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۸۵، ۸۶

(۱۳) آزاد، عبد الخالق، سوانح حیات مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری، رحیمیہ مطبوعات، دہلی، ۲۰۲۱ء، طبعِ سوم، ص ۲۵۵

(۱۴) رائے پوری، حبیب الرحمن، ارشادات مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری، کتب خانہ اختری، سہارنپور، ۱۹۹۹ء، مجلس ۶ رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ / ۱۴ جولائی ۱۹۴۸ء، بروز بدھ، بمقام رائے پور، ص ۲۲۴-۲۲۵

نائب سالار: تحریکِ ریشمی رومال کی تاریخ و سرگزشت سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کو منظّم و مربوط کرنے اور مختلف علاقوں میں مختلف ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے مختلف عہدے و مناصب وجود میں لائے گئے تھے اور بہت سے عہدے داران کا تعین کیا گیا تھا۔ چوں کہ ابھی تک یہ تحریک خفیہ تھی، لہٰذا یہ تعین بھی خفیہ طریقے سے کیا گیا تھا جس کا علم تحریک کے رازداران تک محدود تھا۔ تحریک میں مولانا رائے پوری کا کیا کردار تھا اور اُن کی شخصیت کس عظمت و اہمیت کی حامل تھی اور تحریک کے قائدین وارکان میں اُن کا کیا مقام و مرتبہ تھا، اس کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے جب تحریک کے "منصب دارانِ جنودِ ربانیہ" کی فہرست مرتب کی، تو اُس کے نائب سالاروں میں دوسرا نام مولانا رائے پوری کا تھا[۱۵]۔

شیخ الہند کے قائم مقام اور تحریک کے ناظمِ اعلیٰ و سرپرست: تحریک کے متعین کردہ ہدف کہ 'انگریز اقتدار کے خلاف ایک ہمہ گیر انقلاب شروع کیا جائے'، کی تیاریوں کے آخری مرحلے میں طے شدہ منصوبے کے مطابق جب شیخ الہند کے لیے حجاز کے قیام کا فیصلہ ہوا اور ۱۹۱۵ء میں وہ حجاز روانہ ہونے لگے تو انھوں نے مولانا رائے پوری کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور تمام کارکنان کو تاکید کی کہ اہم امور و معاملات مولانا سے مشاورت کے بعد انجام دیے جائیں[۱۶]۔

وہ اجلاس جس میں شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی قیامِ حجاز کی تجویز منظور ہوئی تھی اور مولانا رائے پوری کو تحریک کی قیادت سونپی گئی تھی، مظاہرِ علوم سہارنپور میں منعقد ہوا تھا۔ اُس کی کچھ تفصیلات شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اپنی تالیف "آپ بیتی" میں تحریر کی ہیں اور مولانا عبدالرشید ارشد، مدیر ماہ نامہ الرشید، ساہیوال کے نام اپنے ایک مکتوب میں بھی ذکر کی ہیں[۱۷]۔

تحریک کی قیادت وسیادت: شیخ الہند طے شدہ منصوبے کے مطابق حجاز میں قیام پذیر تھے اور وہاں

---

[۱۵] تحریکِ شیخ الہند، ریشمی خطوط سازش کیس، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵، ص ۲۷۴

[۱۶] مدنی، حسین احمد، نقشِ حیات، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند، ۲۰۰۷، ج ۲، ص ۲۵۴

[۱۷] کاندھلوی، محمد زکریا، شیخ الحدیث، آپ بیتی، مکتبہ یادگارِ شیخ، سہارنپور، ۲۰۱۴ء، ج ۱، ص ۳۳۲ تا ۳۳۴/ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اِس واقعہ کو الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ مولانا عبدالرشید ارشد، مدیر ماہنامہ الرشید کے نام اپنے ایک مکتوب میں بھی بیان کیا ہے (ماہنامہ "الرشید"، دار العلوم دیوبند نمبر، بابت ماہ صفر المظفر، ربیع الاول ۱۳۹۶ھ / فروری، مارچ ۱۹۷۶ء، جلد ۴، شمارہ ۳-۲، مکتوب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی بنام مولانا عبد الرشید ارشد، مدیر، ص ۱۳۶-۱۳۵، طبع: جامعہ رشیدیہ ساہیوال، پاکستان

سے تحریک کی قیادت کررہے تھے کہ اُن کے نام لکھا گیا مولانا عبید اللہ سندھی کا ایک خط انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس طرح انگریزوں کو اِس تحریک کی بھنک لگ گئی۔ چناں چہ شیخ الہند کو حجاز سے گرفتار کرلیا گیا اور مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔ بہت سے مقامات پر چھاپے مارے گئے اور بہت سے سرگرم کارکنان کو گرفتار کرلیا گیا[۱۸]۔

شیخ الہند کے ۱۹۱۵ء میں حجاز روانگی کے بعد سے لے کر ۱۹۱۹ء میں اپنی وفات تک، جب کہ ابھی شیخ الہند مالٹا ہی میں قید تھے، مولانا نے تحریک کی قیادت و سرپرستی کی اور پورے عزم و استقلال اور رازداری سے تحریک کے اعلیٰ سطح کے کام انجام دیے[۱۹]۔

۱۹۱۵ء کے بعد کا زمانہ، جب تحریک کا راز فاش ہوا اور شیخ الہند کی گرفتاری ہوئی، تحریک کی تاریخ کا بڑا نازک وقت تھا۔ تحریک کا راز فاش ہونے کے بعد اُس کے قائدین و کارکنان کی گرفتاریاں ہوئیں، کئی مقامات پر چھاپے مارے گئے، بہت سے کارکنان سے تفتیش کی گئی، بہت سے افراد شک کے دائرے میں آئے اور بہت سے منتشر اور گوشہ نشین ہوگئے۔ اس طرح تحریک کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک، جب مولانا رائے پوری کی وفات ہوئی، انھوں نے تحریک کی شیرازہ بندی اور شیخ الہند کے مشن کو جاری رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ اِس زمانے میں "رائے پور" تحریک کے اہم خفیہ مراکز میں سے ایک تھا جہاں مولانا کارکنان کی شیرازہ بندی قائم رکھنے کی مسلسل کوشش کررہے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام تک انھوں نے شیخ الہند کے قائم مقام اور تحریک کے ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے تحریک کے اہم امور و معاملات اور اعلیٰ سطح کی کارروائیوں کو نہایت رازدارانہ طریقہ سے انجام دیا جب کہ فروعی امور اور سطحی کارروائیوں کو مولانا احمد اللہ پانی پتی انجام دیتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک کے انتشار و افتراق کے زمانے میں یہ دونوں حضرات کسی نہ کسی طور پر تحریک کو زندہ رکھے ہوئے تھے اور اسے بچانے کی ہر ممکن تدبیر و کوشش کررہے تھے۔ اِن دونوں کے اِس کردار کو مولانا حسین احمد مدنی نے خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" میں سراہا ہے[۲۰]۔

---

[۱۸] الحسینی، سید نفیس، "شعر الفراق"، سید احمد شہید اکادیمی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۸۴

[۱۹] مدنی، حسین احمد، نقشِ حیات، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند، ۲۰۰۷ء، ص ۲۵۴ تا ۲۵۶

[۲۰] مدنی، حسین احمد، نقشِ حیات، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند، ۲۰۰۷ء، ج ۲، ص ۲۴۳ / بعض دیگر مؤرخین کے مندرجہ ذیل بیانات بھی اس بات کی توثیق کرتے ہیں۔ چناں چہ مولانا اسیر ادروی، شاہ انور حسین نفیس الحسینی اور مفتی عبدالخالق آزاد نے اپنی اپنی کتابوں میں اِس واقعے کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسیر ادروی، مولانا، حضرت شیخ الہند

انگریزسی آئی ڈی کی تفتیش: انگریزوں کو جب اِس تحریک کی بھنک لگ گئی اور انھیں اِس کی وسعت و طاقت سے خوف پیدا ہوا اور بڑے پیمانے پر تحقیقات شروع ہوئی اور تحریک کے مراکز پر چھاپے مارے گئے اور سرکردہ افراد اور سرگرم کارکنان کی گرفتاریاں عمل میں آئیں تو انگریزوں کی سی آئی ڈی خانقاہ رائے پور بھی پہنچی اور مولانا رائے پوری سے تفتیش کی۔ حالاں کہ اُن دنوں مولانا صاحبِ فراش تھے، مگر انھوں نے پورے عزم و استقلال اور بے باکی و بے نیازی کے ساتھ انگریز سی آئی ڈی افسران کو جوابات دیے۔

مولانا عبد القادر رائے پوری کے شاگردِ رشید شاہ انور حسین نفیس الحسینی نے اپنی کتاب "شعر الفراق" میں اُن سوالات و جوابات کو قلم بند کیا ہے [۲۱]۔ مولانا حسین احمد مدنی نے بھی اِس واقعے کا مختصر تذکرہ اپنی خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" میں کیا ہے [۲۲]۔

جرأت مندانہ کردار:

الف۔ جرأت مندی اور حوصلہ افزائی: شیخ الہند کی مالٹا اسیری اور تحریک کی نمائندہ قیادت کی گرفتاری کے بعد کا زمانہ تحریک کے انتشار کا زمانہ تھا جب انگریزوں کی قید و بند کے خوف سے بہت سے کارکنان خاموش اور منتشر ہو گئے تھے۔ اِس ماحول میں نہ صرف تحریک سے وابستہ افراد، بلکہ عام واقفین و متعلقین بھی عمومی سطح پر تحریک اور اُس کے علماء و قائدین سے لاتعلقی کا اظہار کر رہے تھے۔ اِس نازک موقع پر مولانا رائے پوری نے پورے عزم و ثبات کے ساتھ لوگوں کی ہمت سازی اور حوصلہ افزائی کی اور اُن کے دلوں سے انگریزوں کا خوف اور حالات سے مایوسی دور کرنے کا فریضہ ادا کرتے رہے۔

شیخ الہند کو جب انگریزوں نے "مالٹا" میں نظر بند کر دیا تھا اور اُن سے وابستہ افراد، اداروں اور جماعتوں پر سخت نظر رکھی جا رہی تھی تو اِن حالات میں بہت سے لوگ اُن کا نام زبان پر لانے سے بھی ڈرنے لگے تھے۔ دیوبند میں شیخ الہند کا جو مکان تھا، نہ صرف عام لوگوں نے، بلکہ اُن کے اعزاء واقرباء اور احباب و متعلقین نے بھی وہاں جانا ترک کر دیا تھا۔ شیخ الہند کی اہلیہ اور صاحب زادیاں مکان پر

حیات اور کارنامے، دیوبند، شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند، ۲۰۱۲ء، ص۱۸۸/ الحسینی، سید نفیس، "شعر الفراق"، سید احمد شہید اکادیمی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۸۴/ آزاد، عبد الخالق، سوانح حیات مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری، دہلی، رحیمیہ مطبوعات، ۲۰۲۱ء، طبع سوم، ص ۲۵۴

[۲۱] الحسینی، سید نفیس، "شعر الفراق"، سید احمد شہید اکادیمی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۸۴

[۲۲] مدنی، حسین احمد، نقشِ حیات، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند، ۲۰۰۷ء، ص ۲۵۴ تا ۲۵۶

اِس طرح تنہا ہو گئی تھیں کہ انھیں اشیائے خورد و نوش خریدنے میں بھی مشکل پیش آنے لگی۔ حالانکہ یہ ایک پُر خطر اور نازک وقت تھا اور شیخ الہند کے تعلق سے کسی بھی قسم کی وابستگی کا اظہار انگریزوں کی تحقیق و تفتیش کو دعوت دینا تھا، تاہم مولانا رائے پوری نے اِس کی پرواہ کیے بغیر شیخ الہند کے مکان پر کئی روز قیام کیا اور دارالعلوم دیوبند جس کے وہ ایک سرپرست رکن تھے، کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس بھی وہیں منعقد کیا۔ نیز وہاں کے دورانِ قیام بلا خوف و خطر حاضرین کو نہ صرف شیخ الہند کے فضائل وکمالات، بلکہ جہاد کے فضائل بھی بدستور وضاحت کے ساتھ ذکر کرتے رہے۔ شاہ انور حسین نفیس الحسینی نے اپنے مضمون "تحریکِ ریشمی رومال کے سرپرستِ اعلیٰ: حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری" میں مولانا رائے پوری کے مسترشدِ خاص اور مجازِ بیعت مستری احمد حسن کے حوالے سے اِس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے[۲۳]۔

ب۔ دورانِ اسیری شیخ الہند سے خط و کتابت: مالٹا اسیری کے دوران بھی شیخ الہند اور مولانا رائے پوری کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ حالاں کہ خطوط کئی کئی مہینوں کے بعد مالٹا پہنچتے تھے، کیوں کہ تحقیق و تفتیش کے مقصد سے انھیں جانچ کرنے کے لیے پہلے لندن لے جایا جاتا تھا اور پھر وہاں سے مالٹا پہنچایا جاتا تھا۔ مولانا کے نام شیخ الہند کا ایک اہم خط کتاب "شیخ الہند مولانا محمود حسن، ایک سیاسی مطالعہ" مؤلفہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری میں موجود ہے۔ یہ مولانا کے ارسال کردہ ایک خط کا جواب ہے۔ غالباً مولانا نے اپنے خط میں شیخ الہند کے مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ہندستان تشریف لانے اور یہیں قیام کرنے کی درخواست کی تھی۔ اِس خط میں شیخ الہند نے مولانا کی اِس درخواست کا جواب بھی تحریر کیا ہے اور مولانا کی شدید خواہش پر قرآن کا جو ترجمہ وہ تحریر کر رہے تھے، اس کے تعلق سے بھی یہ معلومات تحریر کی ہیں کہ یہ کام بدستور جاری ہے اور سورۂ احزاب تک مکمل ہو گیا ہے۔ نیز مالٹا میں اپنی مصروفیات اور اپنے رفقاء کے حالات بھی مختصراً تحریر کیے ہیں[۲۴]۔

---

[۲۳] آزاد، عبدالخالق، سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، رحیمیہ مطبوعات، دہلی، ۲۰۲۱ء، طبعِ سوم، ص۲۶۶ / روایت مستری احمد حسن، و بحوالہ "تحریکِ ریشمی رومال کے سرپرستِ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری" (مضمون)، سید انور حسین نفیس رقم، مطبوعہ ماہنامہ تذکرہ، لاہور

[۲۴] شاہ جہاں پوری، ابو سلمان، ڈاکٹر، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی: ایک سیاسی مطالعہ، مجلس یادگارِ شیخ الاسلام، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص۱۲۵-۱۲۶

ہندو شعراء اور نعت گوئی

محمد فرحت حسین
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، بی آر اے بہار یونیورسٹی، مظفرپور
mdfarhat1994@gmail.com

ملک کے موجودہ صورت حال، خاص کر پچھلی ایک دہائی کی صورت حال پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ کیوں کہ ملک کے اندر جو فضا قائم کی گئی ہے وہ زہر آلود، مہلک اور خطرناک ہے جو جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل چکی ہے۔ اس کے نتیجے میں ملک کے غبارآلود اور زہر آگیں فضا میں سانس لینا دشوار ہے۔ اس میں بہنے والی بیمار ہوا کی زد میں اکثر وہ لوگ آتے ہیں جو صحت مند لیکن بے یار و مددگار ہوتے ہیں اور جلد ہی ان کی قوت مدافعت دم توڑ دیتی ہے۔ معاملہ یہیں تک رکا نہیں ہے۔ اب حالات اتنے بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں کہ اس بادِ سموم کی زد میں وہ بھی آگئے جن کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس تعصب بھرے ماحول میں کوئی بعید نہیں کہ عظیم ترین شخصیت بھی زد میں آجائے جن سے بہتر اور عظیم ہستی دنیا میں کوئی نہیں ہے اور نہ ہو گی۔ ایسے پراگندہ ماحول میں دُوراَز قیاس نہیں کہ ان کی تعظیم و تکریم کے بجائے ان پر پھبتیاں کسی جائیں، گلہائے عقیدت و محبت نچھاور کرنے کے بجائے تنقید و تشنیع کی جائے، احترام بجالانے کے بجائے تمسخر سے کام لیا جائے، آداب و تسلیمات کے بجائے گستاخی اور سر خم کرنے کے بجائے بغاوت و سرکشی پر اترا جائے۔ ادھر ملک ہندستان میں ایسی ہوا چلی ہے جس میں کچھ لوگ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے، تنقید و تشنیع سے گریز نہیں کرتے، تمسخر و استہزا سے باز نہیں آتے حالاں کہ برادران وطن کے بزرگوں نے اسی نبی آخر الزماں ﷺ کی مقدس بارگاہ میں گلہائے عقیدت و محبت نچھاور کیے ہیں، عشق محمدی سے کاسۂ دل لبریز کیا ہے اور مئے الفت محمدی سے بادۂ رسالت کے متوالوں کو سیر اب کیا ہے، اسی کی معرفت الفت، محبوب سے عاشقوں کے دلوں کو آباد کیا ہے اور ذہنی و قلبی سکون کا سامان فراہم کیا ہے۔

اس مضمون میں انھیں قدیم ہندو شعراء کی عشق و محبت کی مختلف جھلکیاں دکھانا راقم الحروف کا

مقصد ہے، کہ کس طرح وہ اہل دل سخنور نے نعتیہ کلام کے ذریعے نبی پاکؐ کے اوصاف حمیدہ واخلاق کریمہ کو سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کی جھلکیاں ان کے کلام کے ذریعے دکھانا چاہتا ہوں تاکہ اس کا روشن پہلو سامنے آئے۔

نعت، اصناف شاعری کی ایک بہترین صنف ہے۔ اس سے وہ شاعر عہدہ بر آ ہو سکتا ہے جس کے پاس معلومات کا خزانہ، زبان پر دسترس ہو اور بڑی بات یہ کہ وہ عاشق کامل بھی ہو، ورنہ شاعر اس میں ناکامیاب ہو جاتا ہے۔ نعت گوئی کوئی آسان صنف نہیں ہے، بلکہ اسے مشکل ترین صنف شاعری میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں محبوب ایسا ذی شان ہے کہ اس کے اوصاف کے ذکر میں محتاط اور چوکنا رہنا پڑتا ہے، یہاں حد بندی کر دی گئی ہے جس سے تجاوز ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر اس حد کو پار کر لیا تو وہ بے ادبی اور گستاخی کہلائے گی۔ یہاں ہم ایسے کچھ ہندو شعراء کا تعارف کراتے ہیں:

مہاراجہ سرکشن پرساد: ان نعت گو شعراء میں سے ایک باکمال اور نعت گوئی میں بے مثال شاعر مہاراجہ سرکشن پرساد المتخلص شادؔ تھے، جن کی نعت گوئی میں انوکھاپن، جدت اور انفرادیت کے سبب ان کے نعتیہ کلام کو ایک بلند اور ممتاز مقام حاصل ہے جن کی نعت میں وہ سب بڑی خوبیاں ہیں جو ابدیت و آفاقیت کا سبب ہیں۔

آپ کا نام 'کشن پرساد' اور تخلص شاد تھا اور آپ دکن کے رہنے والے تھے۔ ذات کے کائستھ تھے جو کہ ہندو سماج میں ایک اونچی ذات مانی جاتی ہے۔ اپنی قابلیت اور فطری صلاحیت کی بنیاد پر دولت آصفیہ کے مدار المہام تھے؛ گویا اپنی لیاقت اور استعداد کی بنا پر سلطنت آصفیہ کے ایک عظیم رکن تھے اور نمایاں کارنامے کی بدولت انھیں القاب و خطابات سے سرفراز کیا گیا۔ قابل ستائش بات یہ ہے کہ مدار المہام جیسے معزز عہدے پر فائز، علم و فن اور عمدہ کارکردگی کی بنا پر ہوئے اور یہ اعجاز اپنے دم پر حاصل کیا نہ کہ کسی کی سفارش پر۔

آپ کا دامن تعصب کے ناگوار دھبوں سے پاک تھا اور آپ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق، یکجہتی و یک رنگی کے حامی تھے، کیوں کہ اس طرح کے خوشگوار ماحول میں آپ کی پرورش ہوئی تھی جس میں کسی طرح کے تعصب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ لہٰذا اردو زبان میں آپ نے شاعری کی اور اپنے خیال کا اظہار بہترین انداز میں کیا۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور فکر و فن کا ایسا جوہر دکھایا کہ ہر صنف میں آپ کا کلام گوہر آبدار کی طرح بیش قیمتی ہے اور اس کی دلکش چمک اب بھی باقی ہے، بلکہ آپ کا کلام عصر حاضر میں بھی موزوں اور بامعنی ہے۔

طبیعت میں سوز و گداز اور دل کے حساس ہونے کی وجہ سے ساقی خمخانۂ وحدت (نبی آخر الزماں ﷺ) سے عشق اور والہانہ لگاؤ تھا، لہٰذا آپ نعت میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ آپ کے نعتیہ کلام کے کچھ اشعار بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں:

کانِ عرب سے لعل نکل کر سر تاج بنا سرداروں کا
نام محمد اپنا رکھا، سلطان بنا سرداروں کا
باندھ کے سر پہ سبز عمامہ کاندھے رکھ کر کالی کملی
ساری خدائی اپنی کر لی مختار بنا مختاروں کا
تیرا چرچا گھر گھر ہے، جلوہ دل کے اندر ہے
ذکر ترا ہر لب پہ جاری، دل دار بنا دلداروں کا
تیرے عرق میں گل کی بو، قامت تیرا سرو جو
بس گئیں کلیاں طیبہ کی، بھاگ کھلا گلزاروں کا
بادۂ عرفاں دیتا ہے ساقی وحدت کے میخانے سے
شادؔ مقدر فضل خدا سے جاگا اب میخواروں کا[۱]

ایک اعجاز: اردو نعت گویوں میں یہ شرف اور اعجاز صرف شادؔ صاحب کو ہی حاصل ہے کہ مدینہ کے اس کتب خانے کی دیوار پر آپ کا نعتیہ کلام آویزاں ہے جو مسجد نبوی کے متصل شیخ الاسلام عارف حکمت نے قائم کیا تھا، چنانچہ سید سلیمان ندوی رسالہ معارف میں 'حجاز کے کتب خانے' کے عنوان سے قسط دوم میں لکھتے ہیں:

منجملہ ان عربی، فارسی اور ترکی منظومات کے یہ دیکھ کر کس قدر تعجب ہوا کہ ان میں ایک اردو کی نعتیہ غزل بھی کاغذ پر خوش خط لکھی ہوئی شیشہ میں جڑی ہوئی آویزاں تھی، نیچے اردو کے اس خوش نصیب شاعر کا نام دیکھ کر اور بھی تعجب ہوا، کہ یہ دکن کا ہندو نام اور اسلام دل صوفی شاعر مہاراجہ کشن پرساد شادؔ (سابق مدار المہام دولت آصفیہ) تھے۔ مطلع اور مقطع یہ ہے:

یہی کہتے ہیں مدح خوان محمدؐ
جو شان خدا ہے، وہ شان محمدؐ

---

[۱] ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، مؤلف فانی مرادآبادی، عارف پبلشنگ ہاؤس، لائل پور، پاکستان، ص ۲۴

شفاعت تری شادؔ کیونکر نہ ہوگی
کہ دل سے ہے تو مدح خوان محمدؐ (۲)

چودھری دلّورام کوثرؔی: نام دلورام تھا اور خطہ پنجاب کے ضلع حصار میں واقع قصبہ نانڈری تھا جو آپ کا وطن مالوف تھا۔ آپ کا تعلق بشنوئی سماج سے تھا جو اس ضلع میں بڑی تعداد میں آباد تھے۔ خوبصورت دل کے مالک تھے جس میں سوز جگر کا عنصر پایا جاتا تھا۔ فارسی، اردو اور انگریزی زبان کے اچھے عالم تھے اور تینوں میں تحریر و تقریر کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چودھری صاحب ایک طویل مدت تک نعت گوئی میں مشغول رہے۔ آپ کو ریاست دکن، بھوپال، رام پور، بھاول پور اور پٹیالہ کے درباروں میں اپنا نعتیہ کلام سنانے اور انعام پانے کا متعدد بار موقع ملا۔

آپ کو فن شاعری میں کسی استاد سخن سے کوئی تلمذ حاصل نہ تھا، بلکہ یہ استعداد آپ میں فطری تھی، لہٰذا اگر آپ کو قسمت کا دھنی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

آپ صاحب دیوان شاعر تھے۔ ایک دیوان محض نعت میں غیر منقوطہ لکھا ہے جس میں تخلص کے بجائے اپنا نام دلورام استعمال کیا ہے۔ آپ کے دل میں عشق نبی کا شمع فروزاں تھا جس کی روشنی اور چمک کلام میں بکھری ہوئی ہے۔ اس کی دلکشی و رعنائی اپنی طرف توجہ مبذول کراتی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ طویل عرصے کے بعد بھی کلام کی چاشنی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے:

مدینے میں مجھ کو بلا یا محمدؐ
ذرا اپنا کوچہ دکھا یا محمدؐ
نہ فرقت میں مجھ کو رلا یا محمدؐ
نہ عاشق کو اپنے ستا یا محمدؐ
خدا تیرا عاشق تو عاشق خدا کا
میں تم دونوں پر ہوں فدا یا محمدؐ
نہیں بادشاہوں کی کچھ مجھ کو پروا
ترے در کا میں ہوں گدا یا محمدؐ

---

(۲) رسالہ معارف، ماہ نومبر ۱۹۲۶ء، عدد ۵، جلد ۱۸، ص ۳۲۹

ترا کوثریؔ رہتا ہے ہندوؤں میں
ہے ظلمت میں آبِ بقا یا محمدؐ [۳]

ایک دوسری نعت میں وصف نبیؐ اور شان محمدؐ کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے:

عظیم الشان ہے شان محمدؐ
خدا ہے مرتبہ دان محمدؐ
نبی کے واسطے سب کچھ بنا ہے
بڑی ہے قیمتی جان محمدؐ
علی و فاطمہ شبیر و شبر
بسا ان سے گلستان محمدؐ [۴]

دو اور شعر ملاحظہ کریں جس میں حقیقت کی ترجمانی خوبصورتی سے کی ہے:

کچھ عشق پیمبرؐ میں نہیں شرط مسلماں
ہے کوثریؔ ہندو بھی طلبگار محمدؐ
کوثریؔ تنہا نہیں ہے مصطفیٰؐ کے ساتھ ہے
جو نبیؐ کے ساتھ ہے وہ کبریا کے ساتھ ہے

قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ انہوں نے حقانیت کی سچی ترجمانی کی ہے۔ عقائد اسلام سے جڑے پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور عشق کا اظہار اس نفاست سے کیا ہے کہ حق ادا کر دیا ہے، مثال ملاحظہ ہو:

مجھے نعت نے شادمانی میں رکھا
کہ معروف شیریں زبانی میں رکھا
درِ مصطفیٰ کی ملے گر گدائی
تو پھر کیا ہے صاحبقرانی میں رکھا
محمدؐ کو بے سایہ حق نے بنایا
یہ پہلا نشاں نقش ثانی میں رکھا

---

(۳) ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، مولف فانی مراد آبادی، عارف پبلشنگ ہاؤس، لائل پور، پاکستان، ص ۶۴
(۴) ہندو شعراء دربار رسول میں، مرتب مولوی محمد محفوظ الرحمن، پبلشر: مطبع گلشن ابراہیم، امین آباد، لکھنؤ، ص ۹

جو ذرہ اڑا شہ کے قدم کا
زمانے نے تاج کیانی میں رکھا
لکھیں کوثریؔ عمر بھر ہم نے نعتیں
نہ کچھ اور غم زندگانی میں رکھا[۵]

خلاصہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں تنوع ہے، انداز بیان نرالا اور زبان وبیان عمدہ ہے، خیالات اچھوتے اور نرالے ہیں، گویا آفاقیت، شعریت، موزونیت جیسی خوبیاں کلام میں موجود ہیں جو کلام کا حسن بڑھاتی ہیں۔

منشی شنکر لال ساقیؔ: شنکر صاحب کائستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا وطن سکندر آباد تھا اور انھوں نے وہیں تعلیم بھی پائی تھی، شاعری کی طرف رجحان ہوا تو اسد اللہ خاں غالب کے تلمیذ رشید تفتہؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور خود میں ایسی صلاحیت پیدا کرلی کہ قادرالکلام شاعر بن گئے۔ ساقیؔ تخلص رکھا جو اشارہ کرتا ہے کہ اشعار کی شکل میں بادۂ رسالت کے متوالوں کو جام پلاتے تھے۔ اشعار ملاحظہ کریں جس میں جام ومینا، ساغر وکباب کی باتیں کیں ہیں:

جب مئے عشق نبیؐ سے مجھے مستی ہوگی
بےخودی ہوگی بلندی نہ پستی ہوگی
بزم عشاق میں جب بادہ پرستی ہوگی
یاد میں ساقی کوثر ہی کے مستی ہوگی
میکشو ہے کرم ساقی کوثر جن پر
لب پہ ان کے صفت بادہ پرستی ہوگی
پی گیا بھر کے جو جام مئے عشق احمدؐ
اس کی مستی کو نہ ہرگز کبھی پستی ہوگی
کچھ غرض جنت و دوزخ سے نہیں ہے ساقیؔ
ان کے مستوں کے لیے اور ہی بستی ہوگی[۶]

---

[۵] ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، مولف فانی مراد آبادی، عارف پبلشنگ ہاؤس، لائل پور، پاکستان، ص ۴۲-۴۳

[۶] ہندو شعراء دربار رسول میں، مرتب مولوی محمد محفوظ الرحمٰن، مطبع گلشن ابراہیم، امین آباد، لکھنؤ، ص ۱۵

منشی دامودر داس: دامودر صاحب یوپی کے شہر کان پور میں پیدا ہوئے لیکن ملازمت کے لیے جبل پور گئے جہاں کچہری میں منصرمی کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ اپنی علمی زندگی میں محبت، ملائمت اور نرمی کے قائل تھے۔ زندگی بھر محبت و الفت کے گیت گاتے رہے اور قومی یکجہتی کے ترانے سناتے رہے، دلوں کو جوڑنے والے نغمے گنگناتے رہے۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے، نفرت وعداوت اور خشونت کے سخت مخالف تھے۔ آپ کا بھی کاسۂ دل الفت محمدی سے لبریز تھا جو کیف ونشاط کے عالم میں خوب چھلکتا اور دوسروں کو سیراب کر جاتا۔

تخلص دروغؔ تھا لیکن اپنے جذبات کو جس دیانت داری سے بیان کرتے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ استعارات سے جو خوبی پیدا کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے اور یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ انھیں لفظوں کا برتنا آتا تھا:

بغیر عشق بتاں کہیے کب ملا ہے خدا
سپاس اس لیے پہلے تولا انھیں کا بجا
ریاض و تقویٰ زہد اور عبادت ہے یہی
حمد و نعت بتان رکھو زبان پر تو سدا
ملے گا تم کو بہر کیف تو وصال صنم
دروغؔ تم نے کہا ہے یہ خوب بسم اللہ[۷]

سالک رام سالکؔ: آپ گروار کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کے باکمال شاعر شمشاد لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اپنی ذہانت وفطانت کی بدولت ان کے محبوب شاگرد بن گئے تھے۔ نعت گوئی کا شوق بہت تھا۔ ان کے کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ عشق نبیؐ نے ان کے دل کو نیم بسمل کر رکھا تھا جس کی وجہ سے سوز وگداز ان کے کلام میں نظر آتی ہے جو دلوں کو پگھلا دیتی ہے۔ کلام میں کسک اور درد بے دوا بھی ہے جو قاری پر وجد کی کیفیت طاری کرتا ہے اور دل کو صد پارہ بھی کرتا ہے۔ گل سرسبد اور اس کے متعلقات سے کس درجہ محبت ہے ملاحظہ کریں:

---

[۷] ماخذ سابق ص ۱۷

لے لیگی مری جان تمنائے مدینہ
مدت سے ہے اب ورد زبان ہائے مدینہ
کیوں کر نہ دل و جان سے مجھے بھائے مدینہ
آنکھوں میں بسا ہے میرے مولائے مدینہ
سرمہ کی طرح آنکھوں میں سالک میں لگا لوں گا
ہاتھ آئے جو خاک در مولائے مدینہ[۸]

منشی راج بہادر زخمی :قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے جہاں سینکڑوں عظیم اور نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں۔ آپ نے طاہر فرخ آبادی سے پہلے شاعری کے آداب سیکھے اور بعد میں ایک اچھے سخن ور بن گئے۔ نمونہ اشعار جس میں الفت محمدیؐ کا اظہار والہانہ انداز میں کیا ہے:

جام بھر کے ہمیں یا ساقی کوثر دینا
ہو گزر حشر میں جس دم لب کوثر دینا
لب شیریں محمدؐ کے جو لکھے اوصاف
شعر ہر ایک ہوا قند مکرر اپنا
کیوں نہ اعجاز محمدؐ کے ہوں قائل اغیار
کر لیا ایک زمانہ کو مسخر اپنا
کیوں نہ مل جائے ہمیں منزل مقصد زخمیؔ
خضر جادہ الفت ہے پیمبر اپنا[۹]

منشی پرساد وہبیؔ :پرساد صاحب اردو کے مشہور زمانہ اخبار 'اودھ اخبار' کے منیجر تھے۔ اسی سے ان کے تبحر علمی، اردو زبان و ادب پر دسترس اور ان کے علم کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے دل میں عشق محمدیؐ کی کیفیت، تڑپ اور بے چینی کا اندازہ ان کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کے سینے میں عشق محمدی کا سمندر موجزن تھا۔ ان کی ایک خوبصورت و پُر مسرت لہر کا مشاہدہ کریں جو بحر محبت میں ظاہر ہوئی تھی:

---

[۸] ماخذ سابق ص ۱۹
[۹] ماخذ سابق ص ۲۰

بے خبر ہو دونوں عالم سے سوائے مصطفیؐ
یا الٰہی دل ہو ایسا مبتلائے مصطفیؐ
شافع محشر ملا ہے کس پیمبر کو خطاب
کون محبوب الٰہی ہے سوائے مصطفیؐ
جو ہوا سائل، رہے اس کو نہ پھر کچھ احتیاج
ایسا کر دیتی ہے مستغنی عطائے مصطفیؐ
آدمی کیا مدح کر سکتے نہیں جن وملک
حق تعالیٰ آپ کرتا ہے ثنائے مصطفیؐ
ہوتی ہے حسرت یہی کیوں دل نہ یہ میرا ہوا
دیکھتا ہوں جب میں وہ نقش پائے مصطفیؐ (۱۰)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے غیر مسلم شعراء ہیں جنھوں نے دربار رسول میں گلہائے عقیدت نچھاور کیے ہیں اور سوزن عشق سے محبت کا ایک خوبصورت چمنستان آباد کیا ہے۔ ہر صوفی دل ہندو شاعر نے عشق و محبت اور حسین جذبات کا اظہار اپنے اپنے انداز میں کیا ہے جس سے اس چمنستان کی خوبصورتی اور بڑھ گئی ہے۔

مذکورہ بالا اشعار جن میں لفظی و معنوی دونوں طرح کی خوبیاں موجود ہیں کہیں سے ایسا نہیں لگتا ہے کہ وہ غیر مسلم شعراء کے ہیں۔ اگر نام نہ تحریر کیا جائے تو کوئی نہیں بتا سکتا ہے کہ یہ پُر درد، پُر سوز اشعار اور عشق نبی میں ڈوبا ہوا کلام ان کے ہیں۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غیر مسلم شعراء نے اردو نعت گوئی کو وسعت و ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

---

(۱۰) ماخذ سابق ص ۲۱

عبداللہ بن فودی اور افریقہ میں اسلام کی علمی روایت کی اشاعت و ترویج

غازی نذیر نقاش

اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ، جموں و کشمیر

ghazinazir7@gmail.com

انیسویں صدی کے مغربی افریقہ میں جن افراد نے اسلام کی علمی روایت کی حفاظت اور نشر و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ان میں عبداللہ بن فودی رحمہ اللہ کا نام سرفہرست ہے۔ آپ شمالی نائجیریا سے تعلق رکھنے والے ایک بلند پایہ عالم دین، مجاہد اور سیاسی رہنما تھے۔ آپ کا مکمل نام عبداللہ بن محمد بن عثمان بن صالح بن ھارون بن گوردو بن جبو بن محمد سمبو بن ایوب بن ماسران بن بوبابابا بن موسی جکولو تھا۔ آپ کی ولادت ۱۱۸۱ھ میں وسطیٰ افریقہ کے فولانی قبیلے میں ہوئی۔ ایک تاریخی روایت کے مطابق یہ قبیلہ فاتح شمالی افریقہ عقبہ بن نافع کی ذریت میں سے ہے[۱]۔ عبداللہ بن فودی نے قرآن پاک اپنے والد محمد کے پاس حفظ کیا۔ آپ کے والد "فودیو" لقب سے معروف تھے جو کہ ہوسا زبان میں عالم دین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی نسبت سے آپ عبداللہ بن فودی کے نام سے معروف ہوئے۔ بنیادی دینی تعلیم کے بعد آپ نے عربی زبان، تفسیر، عقائد، فقہ اور منطق اپنے سگے بھائی شیخ عثمان بن فودیو سے حاصل کیا جو کہ ایک متبحر عالم دین ہونے کے علاوہ سوکوتو خلافت کے بانی اور امیر بھی تھے۔ عبداللہ بن فودی اپنے برادر اکبر کے شاگرد ہونے کے علاوہ ان کی قائم کردہ امارت کے وزیر اعظم بھی تھے۔

عبداللہ بن فودی کی علمی خدمات: شیخ عبداللہ بن فودی کے تبحر علمی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امارت سوکوتو کے قیام اور نظم و نسق میں بہت مصروف ہونے کے باوجود بعض محققین کے مطابق آپ کی چھوٹی بڑی تصنیفات کی کل تعداد ۱۷۰ سے زائد ہے[۲]۔ اگرچہ آپ نے علوم شرعیہ

---

(۱) عمر بن محمد بوي، توضيح الغامضات على تزيين الورقات، مطبعة الامين المحدودة، صكتو، نائجيريا، ۲۰۰۷، ص ۳۷-۳۹

(۲) سعد بن عبد الرحمن، ترتيب الأصحاب، مخطوط، المركز الإسلامي، جامع صكتو، نائجيريا، ص ۱۲

کے تقریباً سبھی میدانوں میں کتابیں لکھی ہیں مگر آپ کا اصل علمی میدان علوم القرآن تھا۔ آپ کی تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر علی اکبر رقمطراز ہیں:

ہماری قوم اس عبقری شخصیت پر صرف ان کی کتابوں کی تعداد اور اہمیت کی ہی وجہ سے فخر نہیں کرتی بلکہ اصل وجہ افتخار آپ کی تصنیفات کا تفسیر، فقہ، تصوف، تاریخ، حدیث، لغت، نحو، صرف، منطق، علم کلام، عروض و ادب جیسے متنوع علوم پر مشتمل ہونا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آپ مغربی افریقہ کی تاریخ اور شاید مستقبل کے سب سے بڑے عالم اور مصنف ہیں۔ اس بنیاد پر اس بات میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ لوگوں نے ان عظیم علمی خدمات کی بنا پر آپ کو عربی السودان کے لقب سے نوازا ہے۔ عالم دین ہونے کے علاوہ آپ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر اور بیدار مغز سیاسی قائد اور رہنما بھی تھے[۳]۔

آپ نے تصنیف و تالیف کا آغاز علمی منظومات سے کیا۔ آپ نے طلبہ کی سہولت کے پیش نظر علوم شریعت کی معروف کتابوں کی بنیاد پر نظمیں لکھیں جو کہ اپنی جامعیت اور علمی قدر و قیمت کے اعتبار سے بیش قیمتی علمی سرمایہ ہیں۔ علم سلوک میں منن المنان، علم عقائد میں العقیدة السنوسية الوسطى، علوم القرآن میں مفتاح التفسير، سلالة المفتاح اور الفرائد الجليلة، علم حدیث میں سراج جامع البخاری اور مصباح الراوی، اصول فقہ میں ألفية الأصول، علم صرف میں الحصن الرصين، نحو میں البحر المحيط اور فقہ میں ضوء المصلی آپ کی مشہور منظومات ہیں جن میں سے سوائے آخری کے سبھی نظمیں ان علوم کی امہات الکتب کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں۔

آپ کی علمی کاوشوں کا دوسرا مرحلہ امارت سوکوتو کے قیام کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں امارت کے نظم و نسق کے پیش نظر آپ نے سیاست شرعیہ کے مختلف گوشوں کے حوالے سے صفحۂ قرطاس کو اپنے علم سے روشن کیا۔ اس مرحلے میں لکھی گئی اکثر کتابوں کا آغاز لفظ ضیاء سے ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ افریقہ کے علمی حلقات میں ضیائیات کے نام سے معروف ہے۔ یہ مرحلہ آپ کی حیات علمی کا سب سے زیادہ اہم اور ثمر آور مرحلہ ہے اور آپ کی اکثر کتابیں اسی مرحلے میں لکھی گئی ہیں۔

آپ کی حیات علمی کا آخری مرحلہ آپ کے برادر اکبر اور مربی شیخ عثمان بن فودی کی وفات سے شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں آپ کی تصنیف و تالیف کا محور علم سلوک رہا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ

---

[۳] ڈاکٹر علی ابوبکر، الثقافة العربية في نايجيريا، مؤسسة عبد الحفيظ البساط، بیروت، ۱۹۷۲، ص ۲۶۴

آپ کی حیات علمی کا آغاز منن المنان سے ہوا اور آپ کی آخری کتاب اسی نظم کی شرح ہے جو کہ شکر الإحسان علی منن المنان کے نام سے معروف ہے۔

آپ کی چند اہم تصانیف:

مفتاح التفسیر: علوم القرآن کا یہ منظوم متن آپ نے ۱۲۰۹ھ میں لکھا۔ یہ نظم امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی دو معروف کتابوں الإتقان فی علوم القرآن اور النقایۃ کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے۔ نظم کے اشعار کی کل تعداد ۱۱۹۴ ہے۔ آپ کی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۴۲۴ھ میں جمہوریہ کامیرون کے عالم دین محمد حافظ بن ابی بکر بن احمد کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے صفحات کی کل تعداد ۲۱۵ ہے۔

سلالۃ المفتاح: طلبۂ علوم دین کی سہولت کے پیش نظر آپ نے مفتاح التفسیر کا خلاصہ سلالۃ المفتاح کے عنوان سے لکھا۔ یہ نظم ۴۷۵ ابیات پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں علوم القرآن کے تقریباً سبھی اہم مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر آدم بللو کی تحقیق اور تصویب کے ساتھ مرکز التفسیر للدراسات القرآنیۃ، سعودی عرب کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اللہ کے فضل سے راقم کو جموں و کشمیر میں یہ نظم طلبہ کو درساً پڑھانے کا موقع ملا ہے جس کے دروس یوٹیوب پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔[۴]

الفرائد الجلیلۃ وسائط الفوائد الجمیلۃ: یہ نظم آپ نے ۱۲۱۱ھ میں لکھی۔ اس کتاب میں آپ نے علوم القرآن کے معروف عالم دین ابوالحسین بن علی بن طلحہ الرجراجی الشوشاوی رحمہ اللہ کی کتاب الفوائد الجمیلۃ علی الآیات الجلیلۃ کو بصورت نظم پیش کیا ہے۔ نظم کے اشعار کی تعداد پانچ سو ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر عبدالعلی عبدالحمید کی تحقیق اور تعلیقات کے ساتھ پہلی بار ۱۴۲۳ھ میں شائع ہوئی۔

ضیاء التاویل في معاني التنزیل: یہ تفسیر عبداللہ بن فودی کی جملہ تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ ضخیم ہے جو کہ ۱۲ شعبان ۱۲۳۱ھ مطابق ۸ جولائی ۱۸۱۶م کو مکمل ہوئی۔ اگرچہ مفسر نے قرآن پاک کی جملہ قراءات اور فقہ کے چاروں مذاہب سے استفادہ کیا ہے مگر افریقہ کی

---

(۴) https://www.youtube.com/watch?v=pBquh-r5EQE&list=PL5qWh_xK6kOmDEmhInXvR6GTrgitCAs9s

اسلامی روایت کے مطابق قرأت میں ورش عن نافع اور مذاہب اربعہ میں مالکی مذہب کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہ تفسیر پہلی مرتبہ ۱۹۶۱ء میں نائجیریا کے اس وقت کے وزیر اعظم محمد بیلو کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ نیز یہ تفسیر احمد ابو السعود اور عثمان الطّیب کے اہتمام سے مطبع استقامہ، قاہرہ سے چار ضخیم اجزاء میں شائع ہوئی ہے۔

كفاية ضعفاء السودان في بيان تفسير القرآن: جیسا کہ اس تفسیر کے نام سے واضح ہے، یہ تفسیر ضیاء التاویل کے برعکس اس وقت کے سوڈانی عوام[۵] کی دینی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔ ضیاء التاویل کی طرح یہ تفسیر بھی بنیادی طور پر قرأت ورش اور مالکی مذہب کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ یہ تفسیر پہلی مرتبہ علاقائی سطح پر الحاج شیخ شاغری کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ اس تفسیر کی جدید طباعت مؤسسۃ غبی، نائجیریا سے ہوئی ہے مگر اس طباعت میں بہت ساری غلطیاں موجود ہیں جن کی طرف ڈاکٹر محمد مودی شونی نے اس تفسیر کی پہلی جلد کے مقدمے میں اشارہ کیا ہے۔

نيل السؤل من تفاسير الرسول: یہ غیر مطبوعہ کتاب امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی الاتقان کے آخری ابواب کا خلاصہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی تفسیری روایات کو جمع کیا ہے۔ نیز مصنف نے علم تفسیر کے آغاز و ارتقاء اور مشہور مفسرین کرام کا تعارف بھی کرایا ہے۔

علوم القرآن کے علاوہ آپ نے مختلف شرعی علوم میں جو کتابیں لکھیں ہیں ان کی ایک مختصر فہرست یہ ہے:

علوم حدیث: ۱۔ سراج جامع البخاری، ۲۔ مصباح الراوي

فقہ: ۱۔ ضياء الأمة في أدلة الأئمة، ۲۔ اللؤلؤ المصون في صدف القواعد العيون، ۳۔ ضوء المصلي

اصول فقہ: ۱۔ ألفية الأصول وبناء الفروع على الأصول، ۲۔ خلاصة الأصول

نحو: ۱۔ البحر المحيط، ۲۔ لمع البرق فيما لذي تشابه من فرق

صرف: ۱۔ الحِصْنُ الرصين، اور السياسة الشرعية، ۲۔ ضياء الحكام فيما لهم وعليهم من الأحكام، ۳۔ ضياء السلطان وغيره من الإخوان، ٤۔ ضياء أولي الأمر والمجاهدين في سير

---

[۵] وسطی اور مغربی افریقہ کے رہنے والے۔

النبي والخلفاء الراشدين، ۵۔ ضياء السياسيات والفتاوى والنوازل

علم عقیدہ: ۱۔ نظم العقيدة الوسطى للسنوسي، ۲۔ العقيدة السنوسية، ۳۔ خلاصة الأصول

علم سلوک: ۱۔ مطيّة الزاد إلى المعاد، ۲۔ كتاب النصائح فى أهم المصالح، ۳۔ منن المنّان لمن أراد شعب الإيمان، ۴۔ شكر الإحسان على منن المنان

متفرقات: فتح اللطيف الوافي لعلمي العروض والقوافي، تزيين الورقات بجمع بعض ما لي من الأبيات، إيداع النسوخ من أخذت منه من الشيوخ

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ آپ نے متعدد علمی رسائل اور سینکڑوں کی تعداد میں مقالہ جات لکھے ہیں جو کہ افریقہ میں اسلام کی علمی روایت کے تسلسل میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وفات: آپ ایک بھرپور عالمانہ اور مجاہدانہ زندگی گزار کر ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء میں خالق حقیقی سے جاملے۔ آپ کی وفات پر علما اور شعرا نے اپنے غم کا اظہار لمبے لمبے قصیدوں کی ذریعے کیا۔

اخبار علمیہ

ترجمے کے مسائل پر دینا مندور کا انٹرویو

مصری مترجم دینا مندور کو فرانسیسی ادب کی سب سے ممتاز مترجمین میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے فرانسیسی سوربون یونیورسٹی سے ”الترجمة العربیہ للروایة الفرنسیة مابعد الاستشراقیة“ (جس کا انگریزی نام دی عربک ٹرانسلیشن آف دی پوسٹ اور ینٹلسٹ فرنیچ ناول ہے) کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔ ان کے نمایاں تحقیقی وادبی کاموں میں ”فلاسفہ اور محبت“، ”دی کرائی آف دی سیگل“، ”دی کنگ ڈم آف دی ریئیوڈ ڈیمائز“ اور ”دی ٹروتھ اباؤٹ دی ہیری کیپر کیس“ وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ فرانس میں ادبی مترجموں کی انجمن کی رکن ہیں۔ ترجمے کے مسائل اوران کے ادبی وعلمی نزاکتوں کے موضوع پر جہاں انہوں نے بہت سی قیمتی باتیں کہیں وہیں ”پوسٹ اور ینٹلسٹ“ یعنی مابعد استشراق ادب کی اصطلاح کے متعلق کہا کہ اس سے مراد ۱۹۹۱ء کے بعد کا ادب ہے۔ ایڈورڈ سعید کی کتاب ”اور ینٹلزم“ (۱۹۷۸ء) اس سے پہلے کی ہے جس نے مغرب کو یقیناً صدمہ پہنچایا تھا۔

(الشرق الاوسط، سعودی عرب ۱۲/اکتوبر ۲۰۲۴ء ص ثقافة وفنون)۔ ک، ص اصلاحی

وفیات

جناب عبد المنان ہلالی مرحوم

محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنفین کے سابق جوائنٹ سکریٹری جناب عبد المنان ہلالی کی وفات کی خبر اکتوبر کے شذرات میں آچکی ہے۔ انتقال کے ہفتوں بعد بھی ان کی شخصیت اپنے ظاہری اور معنوی محاسن کے ساتھ ذہن کے پردے پر موجود و متحرک ہے۔ یہ تاثر دراصل ان کی محبت، سادگی اور نیت و عمل کی پاکیزگی کی بدولت ہے۔

وہ اعظم گڑھ کے ایک گاؤں شیرواں میں پیدا ہوئے۔ ننہال قریب ہی کا ایک گاؤں طویٰ تھا۔ ان دونوں گاؤں سے قصبہ سرائے میر قریب تھا، وہیں ایک مڈل اسکول سے تعلیمی سلسلہ کا آغاز ہوا اور شبلی کالج میں یہ سلسلہ اپنی انتہا کو پہنچا۔ وکالت کی سند بھی حاصل کی اور بعد میں مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ تعلیمات سے ایم ایڈ کی ڈگری بھی مل گئی۔ ۱۹۵۹ء میں ان کو شبلی کالج کے شعبہ تعلیمات میں تدریسی خدمت کے لیے منتخب کیا گیا۔ یہاں قریب اکتیس سال گزارنے کے بعد ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہوگئے۔ چار چھ سطروں میں نصف صدی کی ان کی زندگی کے یہ گویا عنوان اور ابواب آگئے۔ لیکن وہ جب اس طویل سفر کی داستان سنانے پر آتے تو پھر خدا جانے کیسے کیسے کردار، ان کے ذہن اور زبان کے رابطوں کے نتیجہ میں سامنے آتے جاتے۔ نصف صدی سے بھی پہلے کے گاؤں کے حالات، ان رشتوں اور رشتہ داریوں کا ذکر، جن کی حقیقت پر اب نئی نسل کو یقین نہیں رہ گیا اور جو اب بس خواب وخیال بن کر رہ گئی ہے۔ طاعون کے زمانہ میں گاؤں سے باہر بانسوں سے بنائی گئی جھونپڑی میں ان کو جو مزہ آیا، کہنے لگے کہ اب پختہ اور بلند دیواروں نے ان ٹھنڈی ہواؤں سے محروم کردیا۔ تہذیب اور تمدن جدید کے ذریعہ معاشرہ اور بود و باش کی اس خودکشی کو بیان کرتے کرتے وہ چپ ہوجاتے۔ یا شاید اپنے ممدوح اقبال کے شاخ نازک پہ آشیانہ بنانے کی تصویر سامنے آجاتی ۔ وہ خاص طور پر اساتذہ اور معلموں کی توجہ اور شفقت کا جب ذکر کرتے تو مولوی مصطفیٰ، وندھیاچل رائے ، جھوری لال، پروفیسر اختر انصاری، پروفیسر حبیب الرحمن اور ڈاکٹر عرفان اور سید صباح الدین عبد الرحمن تک خدا جانے کتنے ناموں کا وہ لطف ولذت سے ورد کرتے رہتے۔

شبلی کالج کے وہ نائب پرنسپل تھے کہ وظیفہ یابی کا مرحلہ آگیا، دارالمصنفین اور اس کے متعلقین سے وابستگی پہلے سے تھی۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی نظامت کو صرف دو تین سال ہوئے تھے۔ انتظامی امور خصوصاً مطبع معارف کی نگرانی اور مالی مسائل و مشکلات کے حل کے لیے مولانا اصلاحی مرحوم کو ایک مخلص اور تجربہ کار رفیق کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے ہلالی مرحوم کی شکل میں ان کو ایک نہایت معتبر اور لائق شخصیت نظر آئی۔ ان کی اور دارالمصنفین کے ایک اہم رکن شاہ غلام خالد کی خواہش پر کالج سے ریٹائرمنٹ کے دو تین مہینے بعد ہی وہ دارالمصنفین سے وابستہ ہوگئے۔ اس رشتہ کو انہوں نے جس خلوص اور دردمندی اور جس دانش مندی اور معاملہ فہمی اور اس سے بھی زیادہ ایثار و قربانی سے استحکام بخشا، ادارہ اور خود ان کو قریب سے جاننے والے کبھی بھول نہیں سکتے۔ ملکوں اور قوموں کی طرح اداروں میں بھی انقلابات و تغیرات کی داستانیں وقت اپنے قلم سے لکھتا اور زبان حال سے سناتا رہتا ہے۔ ہلالی مرحوم کے سامنے بھی وقت کی کچھ تحریریں آئیں، لیکن ان کو انہوں نے حالات کی زلفوں کا پیچ و خم ہی سمجھا، اسی لئے سنوارنے کے عمل میں وہ سرخ رو ہوئے۔

سرخ رو ہونے کی وجہ ان کا جوش طبیعت اور ہمدوش آسماں ہونے کا جذبہ تھا، ہلالی کی نسبت بھی بقول خود اسی لیے تھی کہ زمانہ تعلیمی سے وہ اقبال اور آزاد کے پرستار بن گئے تھے، خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا، ان کی زبان اور دل پر ایسا چھایا کہ ہلالی نسبت ان کی شناخت ہوگئی۔ بتاتے تھے کہ ایک بار ان کے استاد سید صباح الدین عبدالرحمن نے درجہ میں ان کو ماہر اقبالیات کے خطاب سے نوازا تھا۔ شبلی کالج کی میگزین میں انگریزی اور اردو میں ان کے مضامین نیٹشے اور اقبال پر ہیں۔ آغازِ شباب میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے متاثر تھے معلوم ہوا کہ اسی وجہ سے بچوں کے رسالہ نور میں چھوٹے چھوٹے مضامین بھی لکھے۔ کچھ ترجمے بھی شائع ہوئے۔ مگر بعد میں تدریسی مصروفیات نے مضمون نگاری کی شاید فرصت نہیں دی۔

دارالمصنفین کے شاندار ماضی میں انتظامی امور، تعمیرات اور طباعت و اشاعت کے معاملات کے باب میں مولانا مسعود علی ندوی کا چہرہ ایک مثالی شناخت اور شعار کی شکل میں نمایاں ہے۔ وہ واقعی سالار مسعود تھے کہ فتوحات ان کے جلو میں تھیں، ان کے بعد یہ سالاری قدرت کے احسان کی صورت منان صاحب کو عطا ہوئی۔ ان کی انتظامی صلاحیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اعظم گڑھ میں شبلی کالج کے طلبہ کے لیے علامہ شبلی کی خواہش کے مطابق عرصہ تک ایک بورڈنگ قائم رہی، ہلالی مرحوم اس یادگار کے آخری منتظم تھے۔ بعد میں یہ بورڈنگ انقلاب زمانہ سے معدوم ہوگئی۔ بیس بائیس سال تک انہوں

نے اپنی زندگی کا جیسے ہر لمحہ، دارالمصنفین کی ترقی، مطبوعات کی بہتری، مالی و معاشی آسانی و فراخی اور سب سے بڑھ کر احاطۂ دارالمصنفین کی دیرینہ اور پروقار روایات کی پاسداری کے لیے وقف کر دیا۔ وہ عام ملازمین سے زیادہ وقت کی پابندی کا خیال رکھتے۔ لیکن ہمہ وقتی خدمت کے باوجود مشاہرہ کیا کسی اعزازیہ کی خواہش بھی ان کے حاشیہ خیال میں نہیں آسکی۔

دارالمصنفین کی مسجد کی توسیع میں خاصی اور خطیر مالی معاونت کے ساتھ انہوں نے دن دن بھر موجود رہ کر جس طرح نگرانی کر کے مزدوروں کی مشقت میں شرکت کی وہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ شدید گرمی اور لو کے تھپیڑوں میں بھی وہ سر پر تولیہ رکھ کر مسجد کے پاس بیٹھے رہتے۔ اسی حالت میں ان پر لو کا اثر ہوا اور یہی ان کی زندگی کے آخری دس برسوں تک گویا مرض الموت کا سبب بنا۔ انہوں نے اپنے کچھ حالات لکھے تو اسی باد سموم کے بارے میں لکھا کہ میں بہتر تو ہو گیا مگر یادداشت بہت متاثر ہو گئی۔ اس مرض نسیان نے ان سے دارالمصنفین کو دور کیا اور پھر ان کی خانہ نشینی نے ان کو سب سے دور کر دیا۔ ان کو خود کی خبر نہ رہی۔ ایسے میں ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ظفر طارق اور گھر کے تمام لوگوں نے ان کی خدمت جس طرح کی وہ بھی بے مثال کہی جائے گی اور شاید اس کو ہلالی صاحب کی نیکیوں کا دنیا ہی میں ہلکا سا اجر کہا جائے گا۔

ان کی نیکیوں اور تعلیم و تربیت کی صحیح اور صالح کوششوں کا ثمرہ ہے کہ ان کے دونوں بیٹے اور بیٹی اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہوئے، ڈاکٹر عمر فاروق اور بیٹی قدسیہ تحسین دونوں مسلم یونیورسٹی میں انجینئرنگ اور سائنس کے شعبوں میں پروفیسر ہیں۔ بیٹی قدسیہ کو ایک بار ایسا ایوارڈ ملا جس کے بارے میں مرحوم نے بتایا تھا کہ یہ پہلی بار ایشیا کی کسی خاتون کو حاصل ہوا ہے۔ اسی بیٹی کی فرمائش پر انہوں نے چند صفحات میں اپنی زندگی کی کچھ کہانیاں قلم کے سپرد کر دیں اور ان کو خود نوشت ہلالی کے نام سے شایع کر دیا۔ اثبات ذات کے لیے یہ ان کی پہلی اور شاید آخری مثال ہے۔ ورنہ نام و نمود کے سہاروں اور اشتہار و تشہیر کے حیلوں بہانوں کی وہ ساری زندگی نفی کرتے رہے۔

دارالمصنّفین میں رہ کر مصنف تو نہیں بنے لیکن تصنیفات جتنی ان کے اہتمام میں اور کم وقت میں شایع ہوئیں، وہ ان کے جہد مسلسل کی علامت بن گئیں۔ یہ علامت نہ بھی ہوتی تو بھی ان کے غیر معمولی اخلاقی محاسن، چھوٹوں اور بچوں تک سے ان کا حسن سلوک اور دارالمصنّفین سے والہانہ تعلق ہی ان کی زندگی پر محبت بھری نظر ڈالنے کے لیے کافی ہے۔

اب ایسے لوگ بس خال خال ہوں گے۔ وہ چراغ بھی تو نہیں جن کو لے کر ایسوں کو ڈھونڈا جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجات سے نوازے۔

افضل حق قرشی مرحوم

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

azmi408@gmail.com

محقق و مصنف اور نوادرات کے ماہر مدون افضل حق قرشی (۱۹۴۵- ۲۰۲۴ء) سابق چیرمین شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، پنجاب یونیورسٹی ،لاہور۔ ۲۹/ ستمبر ۲۰۲۴ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

شہرت ،نام و نمود اور سوشل میڈیا کے اس دور میں قرشی صاحب کی ذات خالص علم و تحقیق سے عبارت تھی۔ وہ نہ صرف تحقیق و تدوین اور تصنیف و تالیف کا بلند شعور اور عمدہ مذاق رکھتے تھے بلکہ انہوں نے تحقیق و تدوین کے متعدد علمی و عملی کارنامے بھی انجام دیے اور تاحیات علم و تحقیق سے گہرا شغف رکھا۔ جناب خالد ہمایوں نے لکھا ہے:

> علمی دنیا میں جناب افضل حق قرشی صاحب کا وجود مغتنمات میں سے ہے۔ ان کا علم و دانش سے جتنا زیادہ گہرا تعلق ہے اتنا ہی ریاکاری سے نفور ہے۔ کسی بھی موضوع پر مواد جمع کرتے رہتے ہیں اور جب مطلوبہ معلومات ہاتھ آجاتے ہیں تو پھر قلم اٹھاتے ہیں اور تحقیق کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ (ڈیلی پاکستان،۲۸ فروری ۲۰۱۷ء)

افضل حق قرشی ۱۵ نومبر ۱۹۴۵ء کو کاکول ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کاکول ایبٹ آباد ہی میں حاصل کی۔ اسلامیہ ہائی اسکول مصری شاہ لاہور سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۸۱ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے لائبریری سائنس میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۸۲ء پنجاب یونیورسٹی کے اسی شعبہ لائبریری سائنس و انفارمیشن میں استاد منتخب ہوئے۔ اور ایک بے حد مخلص، ایمان دار، بااصول، اوقات کے پابند اور بے حد شائستہ اور مقبول استاد رہے۔ طلبہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ۱۹۹۵ء میں ترقی کر کے صدر شعبہ مقرر ہوئے اور اپنے شعبے کی ترقی کے لئے برابر فکر مند رہے اور بہت کچھ کیا بھی۔ شعبے سے اس کے ترجمان ”پاکستان جرنل آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس“ کا اجرا کیا اور اس کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ۲۰۰۵ء ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام کا آغاز کرنے میں بھرپور حصہ لیا اور اسی سال ۲۰۰۵ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔

اس کے بعد ۲۰۰۶ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ڈپٹی ڈائرکٹر منتخب ہوئے اور ۲۰۰۸ء

تک اس منصب پر کام کرتے رہے۔ اسی سال یعنی ۲۰۰۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تحقیقات پاکستان یونیورسٹی آف پنجاب کے ڈائرکٹر بنائے گئے۔ اس کے علاوہ اور کئی اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کے رکن اور عہدوں پر فائز رہے۔

قریشی صاحب کو مختلف زبانوں کا علم تھا اور وہ سائنس، ادب اور مختلف علمی موضوعات پر داد تحقیق و تصنیف دیتے رہے۔ ان کے قلم سے اردو اور انگریزی میں درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

۱۔ اقبال کے ممدوح علما۔ مکتبہ محمودیہ لاہور، ۱۹۷۷ء

۲۔ مشاہیر مشرق۔ تخلیقات لاہور، ۱۹۹۹ء

۳۔ ابوالکلام آزاد: ادبی و شخصی مطالعہ، الفیصل لاہور، ۱۹۹۲ء

۴۔ مولانا فضل حق خیر آبادی: ایک تحقیقی مطالعہ، الفیصل لاہور، ۱۹۹۲ء

۵۔ اقبال کا فکر و فن، بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۴ء (طبع سوم)

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی خدمات۔ مکتبہ جمال لاہور، ۲۰۰۹ء

۷۔ اقبالیات تاثیر۔ (مقالات تاثیر) اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۰ء

۸۔ مضامین ڈار۔ (محمد ابراہیم ڈار) مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۱۷ء

۹۔ فیوچر آف اسلام یعنی اسلام کی حالت آیندہ (مصنف: ولفرڈ اسکاون) (مترجم: سید اکبر حسین اکبر آبادی) تدوین و حواشی: افضل حق قریشی۔

ان کتب میں صرف "مضامین ڈار" راقم کی نظر سے نہیں گذری ہے۔ بقیہ تمام کتب اہل علم کے علمی و تحقیقی اور بلند پایہ مقالات کا مجموعہ ہیں۔ ان میں کوئی کتاب طبع زاد نہیں بلکہ مرتبہ ہیں۔ مرتب نے ان کتب پر پیش لفظ بھی مختصر ہی لکھے ہیں۔ اور ان مقالات پر اپنی رائے بھی نہیں دی ہے تاہم مقالات کا انتخاب بہر حال ان کے ذوق علم و فکر و نظر کے شاہد ہیں۔ اور ان شخصیات کے حالات و کمالات اور خدمات مختلف پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

مرحوم کی متعدد کتابیں انگریزی میں بھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

1- *Intellectual legacy*, essays by Dr. Javed Iqbal, Lahore, Iqbal Academy, 2012.

2- *Islam in South Asia*, Lahore Institute of Islamic Culture, 1995.

3- *Iqbal The University Poet*, 2nd edition, Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1994.

4- *Library Education in Pakistan: Past, Present And Future*, Lahore:

PULSAA, 1992.

5- *Role of Professionals Associations in Development of Librarianship in Pakistan*, Lahore: American Centre, PULSAA, 1992.

6- *Hallmarks of Library and Information Services in Pakistan,* Lahore: PULSAA, 1993.

ان کے علاوہ اپنے شعبہ کے کئی علمی منصوبوں (پروجیکٹ) کی تکمیل میں علمی تعاون کیا اور مضامین لکھے اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کتب و مجموعہ ہائے مقالات کے علاوہ رسائل و جرائد میں انہوں نے کثرت سے علمی و تحقیقی مقالات لکھے جو دائرہ معارف اقبال لاہور، دانش نامہ زبان وادب فارسی ایران، اقبال ریویو لاہور، المعارف لاہور، اورینٹل کالج میگزین لاہور، بازیافت لاہور، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری جرنل پٹنہ، مجلہ صحیفہ لاہور، فکرو نظر اسلام آباد، فنون لاہور اور نقوش لاہور وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین و مقالات کو اگر یکجا کیا جائے تو کئی اور مجموعہ مقالات منظر عام پر آسکتے ہیں۔

افضل حق قرشی صاحب نے متعدد سمیناروں اور علمی مذاکروں میں بھی حصہ لیااوران میں مقالات پیش کیے۔ وہ پاکستان کے مشہور علمی و تحقیقی ادارہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ڈپٹی ڈائرکٹر اوراس کے سہ ماہی مجلہ "المعارف" لاہور کے ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۸ء تک ایڈیٹر رہے۔ اوراس کے لئے مضامین لکھے۔ سنہ ۲۰۱۳ء میں مجلس ترقی ادب لاہور کے مشہور ادبی مجلہ "صحیفہ" کے مدیر بنائے گئے اور کئی برس تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

سہ ماہی مجلہ صحیفہ کی ادارت کرتے ہوئے انہوں نے متعدد ضخیم خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا جو اہل علم کے درمیان وقیع اور قابل قدر ٹھہرے۔ ان میں حالی نمبر، شبلی نمبر اور مکاتیب نمبر کی دو جلدیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مشمولات کے تنوع کی بناپر ان خصوصی اشاعتوں کو یقین ہے یاد رکھا جائے گا۔

افضل حق قرشی مرحوم نے اپنے موضوع لائبریری وانفارمیشن سائنس سے متعلق پنجاب یونیورسٹی کے مجلہ (*Pakistan Journal of Library and Information Sciences*) کے بھی ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۶ء تک مدیر رہے۔ اس میں بھی انہوں نے متعدد مضامین لکھے۔

علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنے موضوع لائبریری سائنس کے علاوہ ماضی کی علم وادب اور ملت کی نامور شخصیات اوران کے افکار وخیالات سے انہیں خصوصیت سے شغف رہا

اور ۳۰ سے زاید مقالات قلم بند کئے۔ نامور شخصیات میں مولانا فضل حق خیر آبادی (۱۷۹۷-۱۸۶۱ء) مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء)، علامہ شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء)، علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) اور مولانا ابو الکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) کی شخصیات اور افکار پر ان کی مرتبہ کتابیں یا مجلہ ''صحیفہ'' کی خصوصی اشاعتوں سے قریشی صاحب کی علمی دلچسپیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ برصغیر کے ارباب کمال کے کارناموں کے ساتھ ان کے افکار و نظریات پر گہری نگاہ رکھنے والے اہل قلم تھے۔ ان کی یہ کاوشیں بلاشبہ اہمیت کی حامل ہیں۔

افضل حق قریشی صاحب کوئی علمی و تصنیفی کام سرسری کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ اپنی پوری محنت و تحقیق، دیانت اور حتمی تلاش و جستجو کے بعد جب اشاعت کے لئے مناسب خیال کرتے تھے تب شائع کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی تاحیات علمی شغف رکھنے والے اہل علم و کمال سے زبان و ادب کا معیار و وقار قائم ہوتا ہے اور وہ ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔

مختلف نامور شخصیات کے نوادرات کی جمع و تدوین سے افضل حق قریشی صاحب کو خاص دلچسپی اور شغف رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی علمی جستجو اور ذوق تلاش و تفحص ہی نے ان میں نوادرات کے یکجا کرنے کا جذبہ بیدار کیا۔ اس جذبہ کے بغیر اس طرح کے تحقیقی مقالات وجود میں نہیں آتے۔ اہل قلم اور مصنّفین عمر کے کسی مرحلہ میں اپنے علم اور وسیع مطالعہ و معلومات کی بنیاد پر علمی و ادبی، نظریاتی، تنقیدی اور تحقیقی مقالات سپرد قلم تو کر سکتے ہیں مگر نوادرات کی جمع و تدوین کے لئے ہر مرحلۂ عمر میں لائبریریوں کی خاک چھاننا، سیکڑوں کتب و رسائل کا مطالعہ یا کم از کم ان کی ورق گردانی کی زحمت بہر طور اٹھانی پڑتی ہے۔ اس مطالعہ و تدوین کے عمل میں ضروری نہیں کہ آپ کو کامیابی مل ہی جائے گی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کتب و رسائل کے ہزاروں اوراق الٹنے کے بعد بھی کامیابی نہیں ملتی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تلاش کرنے والوں کو بہت کچھ ملتا ہے اور قریشی صاحب کو بھی بڑی کامیابیاں ملیں:

مثلاً مولانا حالی کے نوادرات پر مشتمل قریشی صاحب کا جو مقالہ ''صحیفہ'' کے حالی نمبر میں شامل ہے اس میں انہوں نے مولانا حالی کے تین مضامین، آٹھ تقاریر، ۳۰ خطوط، دو رسیدیں اور دو منظومات تلاش کر کے پیش کی ہیں۔ اس میں مضامین کے ذیل میں ایک انتہائی اہم اور طویل مضمون ''بھیک مانگنے کی ممانعت اسلام میں'' بھی شامل ہے۔ یہ مفصل مقالہ اولاً کتابچے کی صورت میں شائع ہوا تھا اور نایاب تھا۔ قریشی صاحب کی بدولت دستیاب ہوا اور علمی دنیا اس سے واقف

ہوئی۔ مختلف کتب ورسائل سے ان نوادرات کا جمع کرنا بڑا صبر آزما اور جاں کاہی کا کام ہے۔ اور یہ کام وہی محقق اور مدون دلسوزی سے سرانجام دے سکتا ہے جس کے دل میں تحقیق وتدوین کا جذبۂ صادق موجزن ہو۔

ناچیز نے بھی اس نوع کے علامہ شبلی کے نوادرات کی جمع وتدوین میں حصہ لیا ہے اور بعض کتابیں مرتب کی ہیں۔ اس لئے پتہ ماری کے اس عمل سے بخوبی واقف ہے۔ اپنے تجربات کی بنیاد پر ناچیز کہہ سکتا ہے کہ افضل حق قرشی صاحب واقعی ایک بڑے محقق اور کثیر المطالعہ اہل قلم تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

مرحوم افضل حق قرشی صاحب کا مطالعہ شبلی بھی بہت وسیع وعمیق تھا۔ انہوں نے اگرچہ علامہ شبلی پر محض ایک ہی مفصل مقالہ "نوادر شبلی" لکھا ہے جو "صحیفہ" کے شبلی نمبر میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب (اس وقت علیل ہیں اور دعائے صحت کی درخواست ہے) کے ایک مقالے میں تصحیح واضافے کئے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مقالہ "نوادر شبلی" تحقیق و تدقیق اور تلاش وجستجو کے لحاظ سے کسی تصنیف سے کم رتبہ نہیں رکھتا۔ اسی محنت و تحقیق سے انہوں نے مولانا حالی اور علامہ اقبال کے نوادرات کی بھی جمع وتدوین کی ہے۔ ناچیز نے اپنی مدونہ ومرتبہ کتب میں ان کی بعض تحقیقات سے استفادہ کیا ہے۔

ہمارے درمیان سے ایسے صاحب علم وکمال کا اٹھ جانا سچ تو یہ ہے کہ نہ پر ہونے والا خلا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

آثار علمیہ و تاریخیہ

مولاناعبد الرحمن پرواز اصلاحی مرحوم سیدھا سلطان پور کے رہنے والے تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے بانی مولانا محمد شفیعؒ صاحب کے صاحب زادے، مشہور عالم دین اور محقق تھے۔ ان کا ادبی ذوق اعلیٰ پایے کا تھا۔ عروس البلاد ممبئی میں ایک زمانہ تک رہے۔ وہاں رہ کر انھوں نے مختلف موضوعات پر بڑے گراں قدر علمی و تحقیقی کام کیے۔ مفتی صدرالدین آزردہ، مخدوم علی مہائمی حیات، آثار وافکار کو بہت حسن قبول حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ مزدور اور اسلام، مومن حیات اور شاعری، علم وہدایت کے چراغ اور نظام حق کے معمار وغیرہ نے ممبئی کے علمی وادبی حلقے کو ان کا گرویدہ بنادیا تھا اور وہاں کی کوئی علمی وادبی مجلس ان کی شرکت کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی تھی۔ آخر عمر میں دارالمصنّفین سے وابستہ ہوگئے تھے۔ زیر نظر علمی و عکسی تحریر ان کے متعلق ایک غلط فہمی کی تردید ہے جو انھوں نے چالیس برس قبل اپنی وفات ۳؍ دسمبر ۱۹۸۴ء سے صرف ۸ روز پہلے لکھی تھی۔ یہ کتب خانہ میں ایک کتاب کی ورق گردانی کے دوران ملی۔ مکتوب الیہ کا نام نہ ہونے کی وجہ سے قیاس ہے کہ یہ مولانا کے قریبی اہل علم احباب میں ہوں گے۔ (کلیم صفات اصلاحی)

باسمہ

۲۶؍ نومبر ۸۴ء
دارالمصنّفین۔ اعظم گڑھ

محترمی! سلام مسنون

آپ کے دو عنایت نامے ملے۔ روبی میں واجدہ تبسم کا فلم ابوجہل کے بارے میں جو انٹرویو شائع ہوا ہے، وہ تو نہیں دیکھ سکا۔ اس کا علم مجھے بعض دوستوں کے خطوط سے ہوا۔ میری جانب جو یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ میں نے فلم ابوجہل بنانے کی اجازت دے دی سراسر غلط بیانی پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں نہ واجدہ تبسم سے میری گفتگو ہوئی اور نہ میں نے کوئی تحریر دی۔ البتہ جب مئی کے مہینے میں بمبئی گیا تھا تو ان کے شوہر اشفاق صاحب سے شمس کاتب کے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے ابوجہل پر ایک ڈرامہ لکھ رکھا تھا اور اس کی کتابت کے لیے کاتب کے پاس آئے تھے۔ مجھے مسودہ دکھلایا تو میں نے کہا کہ تاریخی لحاظ سے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ اپنی جگہ صحیح ہیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ میں اس پر فلم بنانا چاہتا ہوں تو میں نے اسی وقت کہا کہ اس میں بڑی نزاکت ہے

اولاً اس میں حضور ﷺ کی تصویر آئے گی جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ کہنے لگے کہ حضورؐ کی تصویر تو میں بالکل نہیں بناؤں گا۔ میں نے کہا کہ صحابہ کرامؓ کی فرضی تصویریں بھی اس میں آئیں گی تو یہ بھی کوئی گوارا نہیں کرے گا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ صحابہ کی تصویریں غیر مکمل اور دھندلی بنائی جائیں تو کیا اس صورت میں جائز نہ ہو گا۔ میں نے کہا کہ اس بارے میں آپ مفتیان دین اور مشہور علما سے فتاوے منگالیں۔ چنانچہ ان کے کہنے پر آٹھ دس پتے علما کے میں نے لکھوا دئے اور انھیں تاکید کی کہ وہ ضرور ان سے رجوع کر لیں۔ اور ان سے دریافت کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھائیں۔

دوران گفتگو میں اچھی اور بری فلموں پر بات چھڑ گئی تو میں نے اصولی طور پر یہ ضرور کہا تھا کہ عام طور پر اخلاق کو بگاڑنے والی فلمیں بنائی جاتی ہیں لیکن نیک مقاصد کے لئے بنائی جائیں اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو تو اس سے مفید نتائج نکل سکتے ہیں۔ سائنٹفک ایجادات ریڈیو، ٹیلی ویژن، ویڈیو اور فلم سے اچھے مقاصد بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں گرچہ عملاً ہو نہیں رہا ہے۔ ممکن ہے کوئی دور ایسا آئے کہ اس سے اصلاحی، تعمیری، تعلیمی اور تبلیغی کام بھی انجام پائے۔ عکسی تصویروں کے بارے میں علامہ قرضاوی مصری کی تصنیف ''حلال و حرام'' کا حوالہ دیا تھا۔

میں نے ایک خط روبی کے مدیر کے پاس بھیج دیا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اسے شائع نہیں کیا گیا۔ اشفاق صاحب نے اپنی غلط فہمی یا سوء فہمی کی بنا پر میری گفتگو سے غلط نتائج نکالے اور خواہ مخواہ میرا نام استعمال کیا۔ میں نہ مفتی ہوں اور نہ فتویٰ دینا میرا کام۔ رضا صاحب[1] سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ چاہیں تو میری تردید شائع کر دیں اور میرے خط کی نقل روبی یا جس پرچہ میں اس کا چرچا ہو دیدیں۔

پتہ نہیں بمبئی کے لوگوں نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی اور کہاں تک روبی کی تحریروں کا ان پر اثر ہوا ہے اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ خیر اندیش

عبد الرحمان پرواز اصلاحی

---

[1] رضا صاحب مولانا کے حاضر باشوں میں تھے۔ میرے پڑوسی گاؤں رسول آباد کے باشندہ اور نفیس مزاج شخص تھے۔ ممبئی میں تلاش معاش کی وجہ سے قیام پذیر تھے۔ میری ان سے ملاقات ہے۔ پرواز صاحب کا ذکر اکثر کرتے تھے **(ک، ص اصلاحی)**

تبصرۂ کتب

ابوسفیان اصلاحی، مدرسۃ الاصلاح کے فضلاء کی قرآنی خدمات،: پروفیسر خلیق احمد نظامی، مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، صفحات ۳۱۲، قیمت ۴۰۰روپیے، سن اشاعت:۲۰۱۹ء

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کا شمار عصر حاضر کے ان کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتا ہے جن سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ اب تک پچاس سے زائد مختلف موضوعات پر مشتمل کتابوں کے مصنف ہیں۔

کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ فاضل مصنف خود مدرسۃ الاصلاح کے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے چند نمایاں اور نامور اصلاحی فضلاء کی قرآنی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس تذکرے میں مندرجہ ذیل دس علماء کی قرآنی خدمات کا ذکر ہے:

۱۔ مولانا اختر احسن اصلاحی۔ شیدائے قرآن

۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔ صاحبِ تدبر قرآن

۳۔ مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی۔ ماہر رموز قرآن

۴۔ مولانا بدرالدین اصلاحی۔ عالمِ قرآنیات

۵۔ مولانا صدرالدین اصلاحی۔ مفسر و محقق علوم القرآن

۶۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی۔ ترجمان فکر فراہی

۷۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی شارحِ فکر فراہی

۸۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی۔ صاحبِ میزان القرآن

۹۔ ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی۔ قرآنی اسکالر

۱۰۔ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی۔ شرح و تحقیق: مفردات القرآن

کتاب مرتب کرتے وقت پروفیسر اصلاحی کو احساس رہا کہ ان کی یہ کاوش تمام اصلاحی فضلاء کی کوششوں کو محیط نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”یہ وہ قرآنی رموز کے حامل اسکالرز ہیں، جن کی تفسیری اور قرآنی خدمات پندرہ ہزار صفحات پر مشتمل ہوں گی۔ ان کے علاوہ بے شمار ایسے ابناء مدرسہ بھی ہیں جنہوں نے قرآنیات کو وظیفۂ حیات بنایا“ (ص ۱۲)۔

مصنفِ کتاب نے لکھا ہے کہ تفسیر تدبر قرآن سے پہلے مولانا اصلاحی 'ماہنامہ الاصلاح' میں قسط وار جو مضمون شائع کر رہے تھے، اسی کو بعد میں ہندوستان میں 'تدبر قرآن' کے نام سے شائع کیا گیا، لیکن اسی دوران تفسیر "تدبر قرآن" زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی تھی۔ دونوں میں فرق کرنے کے لیے پاکستان میں اسے "مبادی تدبر قرآن" کے عنوان سے منظر عام پر لایا گیا (ص ۶۲-۶۳)۔

یہ کتاب مدرسۃ الاصلاح کی قرآنی خدمات پر کام کرنے والوں کے لیے ایک علمی تحفہ ہے۔ اس کتاب میں بعض جگہ ترجمہ نقل کرنے میں تسامح واقع ہوا ہے۔ مثلاً: ومن یرغب عن ملۃ ابراہیم الا من سفہ نفسہ (البقرۃ: ۱۳۰) کا ترجمہ درج ذیل الفاظ میں ہے: "ان پر اللہ کی تمام فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی پھٹکار ہو گی" (ص ۱۴۴)۔ واضح ہے کہ یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔

پروفیسر الطاف اعظمی کی کتابوں کی تفصیل میں ایک جگہ "تجلیاتِ قرآن" (ص ۱۷۴)، اور ایک دوسری جگہ "تجلیاتِ حق" لکھا گیا ہے (ص ۲۳۸) جب کہ صحیح یہ ہے کہ "تجلیاتِ قرآن" مولانا سید جلال الدین انصر عمریؒ سابق امیر جماعت اسلامی ہند کی مشہور کتاب ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی وفات کو ۲۰۰۸ء کے بجائے ۱۹۰۸ء لکھا گیا ہے۔ (ص ۲۰۸) وغیرہ۔

مدرسۃ الاصلاح کے فضلاء کی قرآنی خدمات کی فہرست میں مزید اور ناموں کا اضافہ ہو سکتا تھا مثلاً: مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ جو مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ ان دونوں بزرگوں میں فکری لحاظ سے کافی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ پروفیسر عبید اللہ فراہیؒ نے پچھلے برسوں میں مولانا فراہیؒ کی جو بھی کتابیں ایڈٹ کیں وہ تقریباً سب ہی مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ کی نظر ثانی کے بعد منظر عام پر آئی ہیں۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

ڈاکٹر وارث مظہری، **برصغیر میں جدید علم کلام**، البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۲۴ء صفحات ۲۵۶، قیمت ۳۸۰ روپے۔ ایمیل: abpublications@gmail.com

ڈاکٹر وارث مظہری اس وقت برصغیر کے ممتاز اسلامی اسکالرز میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ متعدد یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تدریس کا فریضہ انجام دینے کے بعد وہ اب دہلی کی جامعہ ہمدرد کے شعبۂ اسلامیات سے منسلک ہیں۔ وہ عرصۂ دراز سے دارالعلوم دیوبند کی تنظیم طلبۂ قدیم کے سہ ماہی مجلہ "ترجمان دارالعلوم" کے ایڈیٹر ہیں اور ایک روایت پرست گروہ سے وابستہ ہونے کے باوجود روشن خیالی اور وسعت ظرفی کے قائل ہیں۔

علم کلام کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب بدلتے ہوئے حالات میں نئی نسلوں کو کسی

عقیدے پر ایمان لانے کے لیے سمعاو طاعۃ کافی نہیں ہوتا، بلکہ وہ عقلی طور پر اپنے عقائد پر مطمئن بھی ہونا چاہتی ہیں۔ مسلمانوں میں یہ ضرورت عباسی دور سے شروع ہوئی جب یونانی فلسفے کا عربی میں ترجمہ ہوا اور نئے سوالات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اس وقت ہونے والے افراط و تفریط سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا اور بالآخر معتزلی فکر کے سامنے روایت پسند فکر کو غلبہ حاصل ہوا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور مسلم علاقوں پر سامراجی قبضے سے نئے مسائل پیدا ہوئے اور مغربی افکار وجدید تعلیم سے نئی نسلوں میں پھر سوالات اٹھنے لگے۔ اس کا جواب عالم اسلام میں الگ الگ طریقے سے دیا گیا۔ یہ کتاب برصغیر میں دیے گئے جواب اور نئے علم کلام کی تشکیل کے بارے میں ہے۔

مصنف کی تحقیق کے مطابق "جدید علم کلام" کی اصطلاح سب سے پہلے سر سید احمد خاں (م:۱۸۹۸ء) نے استعمال کی، البتہ علامہ شبلی نعمانی (م: ۱۹۱۴ء) کو بظاہر یہ اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے اس جدید موضوع پر پہلی کتاب (الکلام) تصنیف کی جس کو برّصغیر کے علاوہ عالم اسلام میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے ترجمے فارسی اور عربی میں ہوئے۔ لیکن مصنف نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ برصغیر میں جدید علم کلام کی ابتداء شاہ ولی اللہ دہلوی (م:۱۷۶۲ء) نے کی ہے۔ انہوں نے اپنی مختلف کتابوں میں احکام شریعت کو برہان کے پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی اور ان کے ابناء و احفاد (شاہ عبدالرحیم، شاہ رفیع الدین) نیز شاہ اسماعیل شہید (م: ۱۸۳۱ء) جیسے علماء نے اپنی تصنیفات میں عقلی طور پر اسلامی عقائد کو ثابت کرنے کی کوشش کی، اگرچہ انہوں نے کوئی مستقل کتاب اس ضمن میں تصنیف نہیں کی۔ شاہ ولی اللہ کی معرکۃ الآراء کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" کو اس طرح کی ایک اہم کوشش سمجھا جاسکتا ہے۔ مصنف کے خیال میں سر سید کی فکر کو ولی اللہی کڑی کا حصہ سمجھنا چاہیے۔

مصنف نے اشارہ کیا ہے کہ روایتی اور مدارس سے جڑے ہوئے علماء نے روایتی فکر کے اندر رہ کر کچھ کوشش کی ہے لیکن وہ بہت مفید نہیں ہے اور روایتی دائرے سے باہر نہیں نکل سکی ہے، بلکہ بعض روایتی علماء، مثلاً مولانا احسن گیلانی، سرے سے اس قسم کی کوشش کے فائدے کے منکر ہیں جبکہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کہتے ہیں ان مدارس میں علم کلام کے تحت جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کو سرے خارج کر دینا چاہیے۔

بہر حال جدید علم کلام کی تشکیل کے لیے جو کوششیں ہوئی ہیں، وہ اقبال کے اس خیال کے تحت ہوئی ہیں کہ اگر اسلامی فکر کو عقلی اسلوب میں پیش نہیں کیا گیا تو نئی نسل کا اعتقاد اسلام پر متزلزل ہو جائے گا۔

مصنف کے خیال میں جدید علم کلام کی تشکیل میں جو کوششیں مسلمانوں نے کی ہیں ان میں جدید مغربی سائنسی فکر سے اکثر سطحوں پر "بلا شرط" سمجھوتہ پایا جاتا ہے۔ اسلامی فکر کی تفہیم کے لیے یہ لوگ مغرب کے وہی عقلی سانچے اور سائنسی پیمانے استعمال کرتے ہیں جس کو عیسائیت کی قلب ماہیت میں پہلے استعمال کیا جا چکا ہے۔ مصنف نے رائے ظاہر کی ہے کہ اسلامی فکر کے ابتدائی تشکیلی مرحلے میں بھی کم و بیش یہی صورت حال پیش آئی تھی۔

مدارس سے اٹھنے والی نئی نسل کلامی سوالات اور چیلنجوں سے واقف نہیں ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے مصنف نے تجویز پیش کی ہے کہ جدید علم کلام کے اہم سوالات اور مباحث و موضوعات پر مشتمل ایک تفصیلی کتاب تحریر کی جائے۔

علامہ شبلی جدید کلامی لٹریچر کے بانی ہیں لیکن ایک طرف تو شیخ محمد اکرام ان کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ شبلی دور جدید میں اعتزالی فکر کے حامی و نقیب تھے، تو دوسری طرف علامہ سید سلیمان ندوی کی کاوش ان کو اشعری و ماتریدی فکر کا پابند قرار دینے کی ہے۔ اسی طرح اقبال کے "خطبات اقبال" کے بارے میں دونوں طرح کی آراء ہیں کہ وہ عقلیت پسندی کے حریف ہیں یا وہ مغربی عقل پسندی کے مجرم ہیں۔

بالعموم اس کتاب میں شاہ ولی اللہ کے کلامی نظریات، سر سید و شبلی کا کلامی فکر، اقبال اور جدید علم کلام اور مابعد اقبال کا کلامی منظر نامہ کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور مولانا وحید الدین خاں کی کوششیں شامل ہیں اور آخر میں موضوع سے متعلق دیگر اہم مساعی پر نظر ڈالی گئی ہے جن میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا احمد رضا خاں، شیخ انوار احمد فاروقی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبد الباری ندوی اور مولانا شہاب الدین ندوی کی کاوشیں شامل ہیں۔

بحیثیت مجموعی اردو میں آج کل شائع ہونے والی کتابوں کے انبار میں خال خال ہی کوئی عمدہ اور تحقیقی کتاب نظر آتی ہے۔ اس استثناء میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔ (ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں)

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، **مولانا شبلی نعمانی شخصیت اور ادبی خدمات**، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۳۶، سن اشاعت ۲۰۲۳، قیمت: ایک ہزار روپے، پتہ: ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۵۸۲۲۱۱

اس کتاب کے مصنف اب علم و فضل اور تدریس و تصنیف کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں،

اردو زبان کی صف اول کے اہل قلم ہیں، لیکن قریب نصف صدی پہلے انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے جب علامہ شبلی اور ان کی ادبی خدمات کو موضوع بنایا تھا، اس وقت شاید ہی کسی نے یہ سوچا ہو کہ جامعات کے تحقیقی مطالعات میں ایسا مقالہ بھی ہوگا جو علامہ شبلی پر لکھی گئی چند بنیادی اور نہایت اہم کتابوں میں بھی امتیازی شان والا کہا جائے گا۔

حیات شبلی، یادگار شبلی، ذکر شبلی، سیرت شبلی اور شبلی ایک دبستاں، یہ وہ کتابیں ہیں جن میں علامہ شبلی کی جامع الکمالات ہستی کو عقیدت مندانہ قربت، تجزیوں اور تصورات کی دور بین یا وقتی معاندانہ جذبات سے یا پھر خاندانی و علاقائی محبت و عقیدت کے زاویوں سے دیکھا گیا، نظروں کے یہ زاویے ظاہر ہے یکساں اور یک طرفہ نہیں ہوسکتے تھے بلکہ یہ اپنی گوناگونی اور رنگارنگی کی وجہ سے مطالعات شبلی کے گلشن کی رنگینی کا سبب بن گئے۔ ایسی جامع اور کامل کتابوں کے بعد اگر ایک نوجوان طالب علم اپنے مقالہ کو اسی صف میں شامل کرنے کا اعزاز حاصل کرلے تو یہ یقیناً نہایت داد و تحسین کے لائق کارنامہ کہا جائے گا۔ ۱۹۷۵ میں اس مقالہ کا آغاز ہوا اور ۱۹۸۱ میں پایہ تکمیل کو پہنچا، لیکن اشاعت کی نوبت قریب چالیس سال کے بعد آئی۔ یقین نہیں آتا کہ ایک نوعمر طالب علم نے علامہ شبلی جیسی ہمہ گیر اور نادر روزگار کی شخصیت کے اندرون تک ایسی رسائی حاصل کی جو اس مقالہ سے پہلے کے کئی نامور شبلی شناسوں کی قسمت میں نہیں تھی۔ اس تحقیقی مقالہ میں دس ابواب ہیں۔ جن میں علامہ شبلی کے خاندان، زندگی کے ابتدائی اور پھر ارتقائی مرحلوں میں ماحول اور سماجی قدروں پر نظر کی گئی۔ مورخ، نقاد، شاعر کی حیثیت سے پہلے علی گڑھ تحریک اور پھر ندوۃ العلماء کی بنا و ترقی و توسیع کا جائزہ کمال کا ہے۔ ان دونوں تحریکوں میں صرف شبلی ہی نہیں سر سید سے لے کر مولانا مونگیری تک دونوں تحریکوں کی گویا مکمل تاریخ بھی آگئی، مدح و قدح دونوں کو جس توازن سے دیکھا اور دکھایا گیا وہ واقعی باعث حیرت ہے۔ معروضیت اور موضوعیت کے نام پر توازن کا خیال ماہرین فن کو بھی غچہ دے جاتا ہے۔ اگر ایک طالب علم کو حسن توازن کو سمجھنے کی صلاحیت اور توفیق ملی تو یہ اس کی تعلیم و تربیت کے غیر معمولی ہونے کی علامت ہی کی جائے گی۔ علامہ کے متعلق ایک نوجوان طالب علم کے یہ خیالات کتنے پختہ اور گہرے مطالعہ پر مبنی تھے کہ شبلی بدقسمت و مظلوم تھے کہ علی گڑھ اور ندوہ میں انہوں نے جو کچھ کیا اس کا صلہ طعن و تشنیع کے سوا کچھ نہ ملا۔ لکھا کہ ان دونوں اداروں سے ان کا جو تعلق تھا اسے آج تک صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔۔۔ علی گڑھ کا مونوگرام جو وہاں کا طرۂ امتیاز ہے اسے پہلی بار شبلی نے سر سید کے سامنے پیش کیا اور ندوہ کا رشتہ عالم اسلام سے

جوڑ کر اسے وہ راہ دکھادی جس پر چل کر آج ندوہ پورے عالم اسلام کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔

مقالہ میں ایک باب علامہ کے خطوط و مکاتیب کے لیے خاص ہے اور یہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ شبلی نے کچھ نہ لکھا ہوتا تو صرف یہ خطوط ہی ان کے بقائے دوام کے لیے کافی تھے۔ شبلی کی روح اگر کہیں بالکل بے داغ ہو کر اور صاف و شفاف ہو کر ملتی ہے تو یہی مکاتیب ہیں۔ عثمانی صاحب کی اس تحریر کی داد پروفیسر آل احمد سرور نے یہ کہہ کر دی کہ یہ باب انتہائی قابل تعریف ہے جس میں مقالہ نگار نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر سرور کی اس رائے سے بجز اتفاق کے کوئی اور پیرایۂ اظہار نہیں۔

قریب ساڑھے پانسو صفحات کی اس ضخیم کتاب کا تعارف ایک مختصر تحریر میں نہیں آسکتا لیکن شبلیات میں اپنی اس قابل قدر محنت کا احساس فاضل مصنف نے دبے الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے کر دیا کہ ۱۹۷۵ء سے پہلے شبلی شناسی کا ایک دور تھا، ۱۹۷۵ء سے اب تک بہت کچھ لکھا گیا لیکن نیا کچھ بھی نہیں بس انداز نظر کا فرق ہے۔ اس لیے انہوں نے خاکسارانہ انداز میں کہہ دیا کہ کیا میرا مقالہ اور کیا میری بساط۔ لیکن جس مقالہ پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا عبداللہ عباس ندوی جیسے دیدہ ور، تعریف و تحسین میں رطب اللسان ہو جائیں اس کی خوبی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ ان دونوں فاضلوں کے پیش لفظ اور مقدمہ نے کتاب میں چار چاند لگا دیے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کو دور جدید کی نام نہاد معروضیت سے ہمیشہ وحشت رہی، ان کا کہنا تھا کہ یہی معروضیت ہر قسم کی فتنہ پروری اور شر انگیزی کا سبب بن جاتی ہے۔ علامہ شبلی کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا کہ بقول سید صباح الدین مرحوم معروضیت کے نام پر در پردہ بدباطنی اور خباثت نفس کو دخل دینے کا موقع مل گیا۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی نے علامہ شبلی کے متعلق کیا خوب لکھا کہ ان کو اللہ نے صدق احساس کی نعمت سے نوازا تھا، ان کی طبیعت میں داؤں پیچ نہیں تھا۔ سیرۃ النبیؐ کی اردو تو کیا عربی میں بھی کوئی مثال ان کے حاسدین و معاندین پیش نہیں کر سکتے، مولانا ندوی نے مدح شبلی کے گویا نئے دروازے کھول دیے۔ انہوں نے بڑی وضاحت اور دلائل سے یہ کہہ دیا کہ اس مقالہ کی داد صرف یونیورسٹی کے حلقہ کے افراد ہی نہیں بلکہ اہل قلب اور اہل ایمان بھی اس کی صداقت کی داد دیں گے۔ ہم بھی اسی احساس میں شریک ہیں۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، **اصول تحقیق: جدید ریسرچ کے اصول وضوابط**، کاغذ وطباعت عمدہ، سافٹ کور، صفحات ۱۹۲، پتہ: فاروس میڈیا اینڈ پرائیویٹ لیمیٹڈ ڈی۔ ۸۴، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی،

سن اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۸۱۸۱۲۰۶۶۹۔ ای میل: books@pharosmedia.com

یہ کتاب عربی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) اور جامعۃ الامام (ریاض) میں ۱۹۹۱۔ ۱۹۹۲ء میں لکچر کے مقصد سے لکھی گئی تھی۔ ۱۹۹۶ء میں بیروت اور عمان (اردن) سے دلیل الباحث کے نام سے شائع ہوئی۔ چار برس بعد ۱۹۹۸ء میں اس کا اردو ترجمہ منظر عام پر آیا۔ مترجمین میں پروفیسر فیضان اللہ فاروقی اور ڈاکٹر عبدالرحمن کا نام شامل ہے۔ بعض مقامات پر مترجمین کے تحریر کردہ توضیحی حواشی بھی ہیں۔ پیش لفظ پروفیسر شفیق احمد ندوی نے لکھا ہے جس میں انہوں نے کتاب کی خصوصیت جامع انداز میں اجاگر کی ہے۔ اردو حلقہ میں کتاب کو مقبولیت ملی۔ اس کا تیسرا اضافہ شدہ ایڈیشن اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

کتاب چھ ابواب اور تین ضمیموں پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں علمی تحقیق کی غرض وغایت اور اس کے مبادی، دوسرے میں بنیادی اور ثانوی مآخذ، تیسرے میں کچھ بنیادی مآخذ جیسے فرہنگ کتابیات (ببلیو گرافی)، تاریخ ادبیات عربی، فارسی زبان میں اسلامیات کے مآخذ وغیرہ، چوتھے میں انٹرنٹ پر عربی اور اسلامی مآخذ، پانچویں میں سماجی موضوعات پر تحقیق اور آخری باب ششم میں علمی تحقیق کے فنی پہلو یعنی مسودات اور نوٹس کی ترتیب، لکھنے کے مراحل، حواشی ومراجع کے اندراج، دلائل پیش کرنے کا طریقہ، رموز وعلامات، مترادفات، اختصارات، کتابیاتی تفصیلات اور عربی حروف کو لاطینی حروف میں منتقل کرنے کے طریقے پر بڑی منطقیانہ اور مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ ضمیموں میں علمی رسائل میں مقالات لکھنے کے طریقوں، مغربی تصنیفات میں مستعمل رموز و اختصارات اور آخری ضمیمے میں عربی، فارسی اور اردو حروف کو لاطینی رسم الخط میں لکھنے کی اسکیموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا اشارات سے کتاب کے اندر موضوعات ومباحث کی تفصیل کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کتاب اپنے موضوع پر بھرپور اور جدید ریسرچ کے اصول وضوابط پر ایسا مواد فراہم کرتی ہے جو اس موضوع کی دوسری کتابوں میں دیکھنے کو شاید و باید ملے۔ مصنّف کی تعلیم ہندوستان، مصر اور برطانیہ میں ہوئی ہے اور انہوں نے تحقیقی تربیت مستشرق پروفیسر بوزورتھ کے زیر نگرانی حاصل کی ہے۔ ان کے بقول ان سے ملنے سے پہلے اصول تحقیق اور اس فن کے مبادی ان کے لیے معمہ تھے۔ ریسرچ کی باریکیوں اور اس کے رازہائے سربستہ سے پردہ ان کی صحبت میں میری نگاہوں سے ہٹا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس میں اپنے ذاتی تحقیقی تجربات کی روشنی میں بھی بہت سی مفید مطلب باتیں بھی لکھی ہیں جو نئے زمانے کے محققین کے کام آئیں گی۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد انٹرنٹ پر موجود انگریزی، عربی اور اردو مآخذ اور ان کے استعمال کے صحیح طریقے سے عام قارئین

اور طلبہ کو متعارف کرانا ہے تاکہ معلومات اور دلائل کو متین و سنجیدہ اسلوب میں پیش کر کے ایسے مفید نتیجہ تک پہنچا جاسکے جس سے معلومات میں اضافہ ہو۔ آج کے سہل پسند تحقیقی ماحول میں ریسرچ کے معنی بالعموم کسی مسئلہ کی دوبارہ تحقیق سمجھ لیے گئے ہیں۔ مصنّف کا کہنا ہے کہ یہ طریقہ معیوب ہے۔ الا یہ کہ پہلی تحقیق غلط یا نامکمل ہو۔

مصنّف کا شمار عربی و انگریزی کے عالمی شہرت یافتہ محققین اور صحافیوں میں ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر بہ ظاہر تضاد بھی نظر آیا۔ مثلاً مصنّف کے بیان کے مطابق التلمود اور تاریخ فلسطین القدیم کی تصنیف کے وقت تحقیقی مقالات کی ترتیب و اصول کے فن سے متعلق کوئی کتاب ان کے سامنے نہیں تھی۔ اس لیے ان میں خامیاں مل سکتی ہیں لیکن فنّی لحاظ سے یہ دونوں کتابیں معتبر ہیں (ص ۲۰) ۔ ظاہر ہے جب کوئی فنی کتاب پیش نظر نہیں تھی تو فنّی لحاظ سے دونوں کتابیں معتبر کیسے ہو گئیں؟۔ اسی طرح تحقیقی کتاب میں ببلیو گرافی (کتابیات) کی اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے لیکن موجودہ انداز کے مطابق خود کتاب کے آخر میں کتابیات کے اندراج سے عاری ہے۔ ص ۷۴ پر ابن خلدون کی کتاب العبر کا سنۂ طباعت ۱۲۸۴ء اور مطبع کا نام مطبع بولاق لکھا ہے جب کہ یہ ۱۲۸۴ ہجری اور مطبع کا نام المطبعۃ المصریہ بولاق ہے۔ ص ۱۲۳ کے حاشیے میں لکھا گیا ہے کہ پی ڈی ایف مواد کو بدلا نہیں جاسکتا حالانکہ اب ایسی سہولتیں آگئی ہیں کہ ان کا استعمال کر کے پی ڈی ایف کے بیشتر مواد کو ٹکسٹ (متن) میں لایا جاسکتا ہے۔ البتہ اعداد اور سنین وغیرہ ادھر ادھر ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح مصنّف نے اردو میں رسرچ بغیر یا کے لکھا ہے جب کہ اسی کتاب میں بیشتر مقامات پر یا کے ساتھ ریسرچ لکھا گیا ہے۔ پروف کی غلطیوں کی جانب مزید توجہ کی ضرورت تھی۔ ان معمولی فروگزاشتوں سے قطع نظر کتاب کی افادیت و نافعیت میں کوئی شبہہ نہیں۔ حاملان بساط تحقیق کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

مولانا ابن الحسن قاسمی، **مفتی محمد حنیف جونپوری، حیات و آثار**، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۵۲۰، پتہ: مدرسہ اسلامیہ عربیہ بیت العلوم سرائے میر، اعظم گڑھ، سن اشاعت، ۲۰۲۳، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۵۸۶۵۰۰۱ ۔ ای میل: ibnulhasanqasmi@gmail.com۔

مولانا مفتی محمد حنیف صاحب ایک متقی اور صاحب دل عالم اور مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری کے محبوب و ممتاز تلامذہ میں تھے۔ ان کی زندگی بڑی کشاکش میں گذری۔ تعلیم کا آغاز پرائمری اسکول سے ہوا۔ معاشی تنگی کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ موقوف ہو گیا اور تلاش معاش کے لیے ممبئی میں بیس

سال محنت مزدوری کی اور مختلف پیشوں سے معاش کا بندوبست کیا۔ پھر علوم باطنی کی طرف میلان مولانا تھانویؒ کے مواعظ ثلاثہ اور راحت القلوب کے مطالعہ سے ہوا۔ ان سے مکاتبت ہوئی اور ان ہی کے ایما سے مولانا شاہ وصی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دنیا ہی بدل گئی۔ متعدد مشہور مدارس جیسے ریاض العلوم، گورینی، بیت العلوم، سرائے میر وغیرہ اور آخر میں دارالابرار میں تدریس کی خدمات انجام دی اور یہیں تدفین عمل میں آئی۔

پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مفتی صاحب کی حیات و خدمات کا احاطہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ ان کے مزاج و مذاق، فقہی مقالات و علمی کمالات، فتوی نویسی، تالیفات، مکاتیب، ملفوظات، خطبات اور آخر میں شخصیت اور تعارف کے نام سے ان کے بعض مشہور تلامذہ کے بڑے قیمتی تاثراتی مقالات بھی شامل کتاب ہیں۔ مصنّف نے ان کی شخصیت کا کوئی ایسا پہلو یا گوشہ شاید ہی چھوڑا ہو جس سے قاری کو اس میں کوئی سبق موجود نہ ہو۔

ایک جگہ بھگوان کی لغوی و معنوی بحث کرتے ہوئے ان کا دلچسپ موقف یہ لکھا گیا ہے کہ لفظ بھگوان کا دال علی النقص ہونا ظاہر ہے اس لیے ان کے نزدیک اللہ رب العزت کو بھگوان کہنا ناجائز ہے (ص ۱۰۳) مفتی صاحب نے جشن بخاری کا بدعت ہونا بدلائل ثابت کیا ہے اور بتایا کہ جب کسی امر کا ثبوت ہو لیکن اس کے ساتھ جب خرافات شامل ہو جائیں تو وہ حد جواز سے نکل کر بدعات میں شامل ہو جاتا ہے۔ (ص ۱۱۰)۔

مصنّف نے اس سے پہلے تذکرہ علمائے مہراج گنج، نقوش حیات مفتی عبداللہ پھول پوری، تاریخ بیت العلوم، جغرافیہ مہراج گنج وغیرہ لکھ کر اپنی تالیفی و تصنیفی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے شروع سے ایسے موضوعات یا شخصیات کا انتخاب کیا جن پر ان سے پہلے بہت کم لکھا گیا ہے۔ مفتی حنیف صاحب جیسی نسبتاً کم معروف شخصیت پر نئے سرے سے نہ صرف قابل قدر مواد اکٹھا کر کے سلیقہ سے پیش کیا ہے بلکہ واقعات کے ذکر میں اعتدال سے بھی کام لیا ہے۔

ک، ص اصلاحی

غزل

وارث ریاضی

کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج) پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار

آگ نفرت کی بجھاتے جایئے
شمع الفت کی جلاتے جایئے

عشق کی دولت لٹاتے جایئے
حسن کو خودبیں بناتے جایئے

دوستی کی لاج رکھنی ہے اگر
چوٹ کھاکر مسکراتے جایئے

دے نہیں سکتے ہیں جب دل کو سکوں
یہ بھی کیا ہے دل دکھاتے جایئے ؟

کچھ نہ کچھ تعبیر نکلے گی ضرور
جان من! سپنے دکھاتے جایئے

ساز دل پر یا رَباب عشق پر
نغمۂ غم گنگناتے جایئے

دوست ہی کیا؟ دشمنوں کے زخم پر
مرہم تسکیں لگاتے جایئے

شمع تو جلتی رہے گی رات بھر
آپ بھی آنسو بہاتے جایئے

آپ وارث دشمنوں کی راہ میں
پھول کی چادر بچھاتے جایئے

غزل

خالد ندیم، سرگودھا، پاکستان

تخت اِک پَل میں تختہ بھی ہو سکتا ہے
مستحکم پُل خستہ بھی ہو سکتا ہے

ہو سکتا ہے کہ صدیوں کی تیاری ہو
سانحہ تو برجستہ بھی ہو سکتا ہے

انساں سے غلطی ہونا لازم تو نہیں
بخت معاً برگشتہ بھی ہو سکتا ہے

ممکن ہے کہ پھول تجھے زخمی کر دیں
خار مجھے گلدستہ بھی ہو سکتا ہے

مستقبل کے منظر نامے کا ہر جزو
ماضی سے پیوستہ بھی ہو سکتا ہے

ہجر میں دید کے امکانات بھی رہتے ہیں
بزم تِری میں سکتہ بھی ہو سکتا ہے

ممکن ہے ، در میں روزن کی راہ نہ ہو
اور دیوار میں رستہ بھی ہو سکتا ہے

بات ندیمؔ کی یوں نہ نظر انداز کرو
دل بستہ ، وابستہ بھی ہو سکتا ہے

معارف کی ڈاک

استدراک: خانزادہ بیگم

راقم کا ایک مضمون ''خانزادہ بیگم: بابر کی محسن بہن'' معارف کے پچھلے شمارے (ستمبر ۲۰۲۴ء جلد ۲۱۱ عدد ۹) میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون ان دو سطروں پر ختم ہوا ہے: ''خانزادہ بیگم کے اس سے زیادہ احوال معلوم نہیں ہو سکے، شاید اسی بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہ بابر کے ہندوستان فتح کرنے کے وقت زندہ نہیں تھیں''۔ یہ بیان درست نہیں۔ اس موضوع پر مزید مطالعے سے معلوم ہوا کہ:

بابر نے اپنی اس بہن کو ''بادشاہ بیگم'' کا خطاب دیا تھا۔ مغلوں کی تاریخ میں یہ خطاب اس سے قبل کسی کو عطا نہیں کیا گیا تھا۔ بابر نے خانزادہ بیگم کی اپنے ایک دوست اور امیر الامرا محمد مہدی خواجہ سے شادی کرا دی تھی۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ خانزادہ بیگم نے اپنے ان شوہر (محمد مہدی خواجہ) کی دو سالہ بہن سلطانیم کو گود لے لیا تھا اور اپنی اولاد کی طرح اس کی پرورش کی تھی۔ بعد میں بابر کے لڑکے ہندال سے اس کی شادی کرا دی گئی تھی[۱]۔

شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کے بعد ہمایوں نے ایران جاتے ہوئے اپنے شیر خوار فرزند اکبر کو افغانستان ہی میں چھوڑ دیا تھا جہاں خاندان کے افراد اور خدمت گاروں نے اکبر کی پرورش کی۔ ان میں ایک خانزادہ بیگم بھی تھیں۔ بابر نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے مستحکم ہونے کے بعد شاہی خاندان کی تمام خواتین کو ہندوستان میں آگرے بلا لیا تھا۔ ان میں خانزادہ بیگم بھی تھیں۔ ہمایوں کی شیر شاہ سے شکست کے بعد یہ خواتین کابل بھیج دی گئی تھیں۔ ہمایوں نے خانزادہ بیگم کو، جب وہ ۶۴ برس کی تھیں، اپنے دو مخالف بھائیوں کامران اور عسکری سے صلح کرانے کے لیے قندھار بھیجا تھا۔ خانزادہ بیگم اپنے اس مقصد میں ناکام رہیں اور قندھار سے کابل آتے ہوئے، راستے میں فوت ہو گئیں[۲]۔

والسلام

شریف حسین قاسمی، دہلی
indianmanuscript@gmail.com

---

(۱) Ira Mukhoty: *Daughters of the Sun,* Alph Book Company, New Delhi 2018, p 47.

(۲) Pravati Sharma, *Akbar of Hindustan,* Juggurmaut Book, Delhi, 2022, pp. 10,34,35,36.

معارف

معارف اپریل ۲۰۲۴ء میں "مسئلہ فلسطین پر ایک طائرانہ نظر" کے زیر عنوان فلسطین کے قضیے پر جس شرح وبسط اور تاریخی پس منظر کے ساتھ آپ نے جو خامہ فرسائی کی ہے، وہ مجھ جیسے معارف کے ہیچ مداں قاری کے لیے اطلاعِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح معارف ستمبر ۲۰۲۴ء میں جناب خالد ندیم سرگودھا پاکستان نے اپنی نظم معنون "غزہ کہاں ہے؟" کے ذریعے غزہ اور اہل غزہ کو یہودی حملے اور صہیونی شکنجے کے توسط سے غازہ بنائے جانے کے دلخراش منظر، داستان دلفگار اور جوئے اشکبار کی اپنے موئے قلم سے بڑی دردناک تصویر کشی کی ہے۔ اس کی حدتِ احساس اور شدتِ جذبات کو ہر وہ انسان محسوس کر سکتا ہے، جس کے پہلو میں دھڑکتا ہوا دل ہو۔

خود ملک عزیز ہندوستان جنت نشان کے اہل اسلام کو انہی حالات سے دوچار کرنے کے جذبے سے سرشار برہمنی نظام پر مبنی مرکزی آر. ایس. ایس سرکار بتدریج اپنے خفیہ عزائم اور پوشیدہ منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے آئین کو بے معنی وبے فیض کرتے ہوئے پے در پے نت نئے قوانین لاگو کرنے کی کوشش کرتی جارہی ہے، جس کی تازہ ترین مثال وقف ایکٹ کا معاملہ ہے۔ اس کے حقائق، کنہیات اور عواقب ومضمرات کہ افہام وتفہیم میں اسی شمارے کا چشم کشا اداریہ بعنوان "شذرات" بے حد ممد ومعاون ہے، جو اپنے اسلوبیات، محتویات اور ابعاد وجہات کے لحاظ سے ہر اردو داں طبقے کے گھر کی ضرورت وزینت ہے۔

بہر کیف بالائے ذکر معارف ہی کے شمارے میں مذہبی روح اور ادبی جمال سے مملو آپ کی نگارش "عصر حاضر میں اسلامی احیاء کے لیے فکری اور علمی اقدامات" بھی نظر نواز ہوئی۔ اس کے ڈکشن، ڈائریکشن اور ڈائمنشن میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی اپنے حالیہ زیر مطالعہ کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ آپ نے اس میں اسلام کے مطلوب جس عملی نمونے کی پیشکش کی بات کہی ہے، اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ اور اہل اسلام کی جانب سے اس پریکٹیکل ماڈل کی عدم پیشکش پر جو رونا رویا ہے، وہ مبنی بر حقیقت ہے اور ہمیں حقیقت کے اس تلخ جام کو اپنے لبوں سے لگالینے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے۔

راجو خان، راجستھان
۹۱۲۲۷۸۰۱۹۸

(۲)

الحمدللہ کہ اس مرتبہ **معارف** کا شمارہ ماہِ اکتوبر کے طلوع سے قبل ہی نظر نواز ہو گیا۔ شذرات سے آپ کی دردمندی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے، جس پر کسی تبصرے کی ضرورت ہے۔ یہ واقعات اور سانحات کسی ایک خطے تک محدود نہیں رہے، بلکہ پوری دنیا میں ان کا اعادہ کیا جا رہا ہے اور مختلف مقامات پر نوعیت کے فرق کے باوجود نتائج کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ شذرات کے آخر میں مولانا شاہ تقی الدین فردوسی ندوی اور پروفیسر عبد المنان ہلالی سے متعلق خبروں نے فضا کو مزید سوگوار کر دیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مقالات میں ڈاکٹر عارف نوشاہی، جنابِ کلیم صفات اصلاحی، عادل حسین وگے اور ڈاکٹر غلام نبی / نصیر الاسلام کے مقالات سے علم وآگہی کے متعدد در وا ہو گئے، بالخصوص ڈاکٹر عارف نوشاہی کی علمی وتحقیقی سنجیدگی سے **معارف** کے استفادے اور اس کے توسط سے قارئین کی ذہنی ترتیب پر نہایت اطمینان ہوتا ہے۔ زریاب احمد فلاحی نے پروفیسر ڈاکٹر عبد الرحیم قدوائی کی قرآنی خدمات کے اعتراف میں بہت عمدہ مقالہ لکھا ہے۔ ہم عصروں کے اعتراف میں **معارف** کا یہ قدم یقیناً لائقِ تحسین ہی نہیں، قابلِ تقلید بھی ہے۔

خالد ندیم، سرگودھا (پاکستان)

dr.khalidnadeem@gmail.com

تحفۃ النصائح

محترمہ اختر النساء، سینئر ریسرچ فیلو، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا جو مضمون معارف، اعظم گڑھ کے شمارۂ اکتوبر ۲۰۲۴ میں شائع ہوا ہے، وہ اپنے عنوان " تحفۃ النصائح کے خطی نسخوں کا تعارف " کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔ مضمون کا عنوان پڑھ کر قاری کو خوش گمانی ہوتی ہے کہ وہ اس مضمون کے مطالعے سے تحفۃ النصائح کے تمام یا کم از کم اہم ترین نسخوں کے بارے اطلاعات حاصل کرے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ مذکورہ مضمون سے استنباط ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے یونیورسٹی سَندی مقالے کے طور پر تحفۃ النصائح کی تصحیح وتدوین کی ہے (ص ۶۳) اور یہ مضمون اسی سَندی مقالے کا دیباچہ ہے۔ مضمون نگار کو اس کتاب کے صرف گیارہ نسخے دستیاب ہوئے جو سب

ہندوستانی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے انھوں نے صرف پانچ نسخوں کا تعارف لکھا ہے اور بقیہ چھ کو قلم انداز کر دیا ہے۔

امر واقع یہ ہے کہ تحفۃ النصائح فقہ حنفی کے مسایل اور اخلاقیات کے حوالے سے برّصغیر پاک وہند میں ایک مقبول ترین منظومہ رہا ہے۔ اس کی مقبولیت کی دلیل اس کے قلمی نسخوں کی کثرت اور مکرّر طباعت واشاعت سے بھی ملتی ہے۔ لیکن مضمون نگار نے صرف گیارہ نسخوں کا ذکر کرنا اور محض پانچ نسخوں کا تعارف لکھنا کافی سمجھا ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اِس وقت دنیا بھر میں تحفۃ النصائح کے تین سو اسّی (۳۸۰) قلمی نسخے دریافت ہو چکے ہیں۔[۱] ان میں سے ایک سو سڑسٹھ (۱۶۷) نسخے پاکستانی کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں اور ان کے کوائف بھی موجود ہیں۔[۲] پاکستان میں اس کتاب کا قدیم ترین نسخہ، جس پر واضح طور پر تاریخ کتابت ۱۰۳۱ ہجری درج ہے، ایک شخص مقرب الدین، ساکن احمد آباد، تحصیل پنڈ دادن خان، ضلع جہلم کی ملکیت ہے۔ دوسرا قدیم نسخہ بھی، جس کی تاریخ کتابت ۱۰۹۱ ہجری ہے، نجی طور پر رب نواز نامی شخص، ساکن للیانی، تحصیل بھلوال، ضلع سرگودھا کے پاس ہے۔[۳] اس کے علاوہ بھی پاکستان میں تحفۃ النصائح کے کئی نسخے ملتے ہیں، جن کی تاریخ کتابت، اُن پانچ نسخوں سے کہیں اَقدم ہے جو محترمہ اختر النساء نے متعارف اور استعمال کیے ہیں۔ اگر مضمون نگار فارسی مخطوطات کی فہرستیں بالاستیعاب دیکھ لیتیں جو یقیناً مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہیں تو انھیں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اس سے بہتر نسخوں کی نشان دہی ہو سکتی تھی۔

اگر ہم تحفۃ النصائح کی طباعت واشاعت کی بات کریں، اب تک پینسٹھ (۶۵) اشاعتیں ہمارے علم میں ہیں۔ قدیم ترین اشاعت بہ تصحیح مولوی غلام محمد بن مولوی شمس الدین، ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء

---

(۱) یہ اعداد و شمار ہمارے ایرانی فاضل دوست مصطفی درایتی نے مہیا کیے ہیں جنھوں نے برّصغیر کے فارسی مخطوطات کی فہرست تیار کی ہے اور یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

(۲) احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، ج ۷، ص ۴۲۵ - ۴۳۵؛ ج ۱۴، ص ۷۴۴؛ عارف نوشاہی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، ج ۱، ص ۲۶۸، ۲۶۹

(۳) عارف نوشاہی، حوالہ مذکور۔

میں، مطبع مخدومی کی ہے۔ محترمہ اختر النساء کے زیر استعمال نسخوں میں سے ایک (نسخۂ خدابخش) کی تاریخ کتابت ۱۱۸۳ھ ہے، اسے چھوڑ کر، تحفۃ النصائح کے مطبوعہ نسخے مضمون نگار کے متعارف کردہ قلمی نسخوں سے بھی قدیم تر ہیں۔

تحفۃ النصائح کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے، (جس کا ذکر مضمون نگار کو کرنا چاہیے تھا) کہ اس کی شروح و حواشی لکھے گئے ہیں اور اردو ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ ایک مفصل فارسی شرح ھدیۃ الروائح فی حل تحفۃ النصائح نام سے محمد بن غلام محمد گلھوی ملتانی نے لکھی۔ یہ متعدد بار چھپ چکی ہے، پہلی اشاعت ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ کی مطبع محمدی لاہور سے ہے۔ اس کے قلمی نسخے بھی دستیاب ہیں۔ حافظ ظہیر احمد سہسوانی بدایونی نے ظہیر اللوائح نام سے اس کا منظوم اردو ترجمہ کیا جو ۱۳۳۹/۱۹۲۰ء میں لاہور سے چھپا۔ سید کلیم اللہ حسینی نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ۲۰۰۳ء میں کراچی سے دوسری بار چھپ چکا ہے۔ محمد احمد سعیدی نے اس پر اردو حاشیہ لکھا جو ملتان سے چھپا۔ پشتو زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔[۴] معلوم نہیں مضمون نگار نے اپنے سندی مقالے میں ان چیزوں کا ذکر کیا ہے یا نہیں۔ یہ چند باتیں ان کی اطلاع کے لیے لکھی گئی ہیں۔

ان کے زیر بحث مضمون میں کچھ تسامحات بھی ہیں جن کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔

مضمون نگار کے جملے "ان کی خود نوشت تحفۃ النصائح کے تمام مخطوطات" (ص ۶۱) سے مراد اگر یہ لیا جائے کہ مصنف یوسف گدا کے اپنے ہاتھ سے کتابت کردہ تحفہ النصائح کے نسخے بھی موجود ہیں تو یہ قیاس درست نہیں ہوگا کیوں کہ بخط مصنف کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ مضمون نگار نے آگے چل کر نسخہ سالار جنگ میں اشعار کی تعداد ۷۷۶ اور اس کا سال تکمیل ۷۹۵ھ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مصنف کے زمانے سے کچھ ہی عرصہ بعد کا ہے (ص ۶۳)۔ یہ صرف نسخہ سالار جنگ کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ تحفۃ النصائح کے ہر نسخے کا یہی حال ہے کیوں کہ مصنف نے اختتام پر اپنی نظم کے اشعار کی کل تعداد ۷۷۶ اور سال تکمیل ۱۰ ربیع الثانی ۷۹۵ھ بتایا ہے۔ یہ دو مصرعے ملاحظہ ہوں:

ابیات گفتم جملگی ہفت صد بر ان ہفتاد و شش
ہفصد نود و پنج دگر ہجرت محمد مصطفی

---

[۴] عارف نوشاہی، کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ، ج ۱، ص ۵۱۰-۵۱۳؛ ج ۵، ص ۳۱۵۶

معلوم نہیں مضمون نگار نے یہ کیسے متعین کرلیا کہ نسخہ سالار جنگ مصنف کے زمانے سے کچھ ہی عرصہ بعد کا ہے جب کہ اس پر کوئی تاریخ کتابت بھی نہیں ہے! مضمون نگار نے اس نسخے کے ابتدا میں درج دو فارسی شعروں کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ درست ترجمہ یوں ہے:" اے خدا اپنے فضل اور سخاوت کے صدقے، اپنی رحمت اور اظہار عدل کے صدقے، زمین اور آسمان پر اپنی قدرت کے صدقے اور خاک کے پردے میں اپنی کاریگری کے صدقے۔" اس نسخے کے ترقیمے میں "تمت تمام شد" کو مضمون نگار نے "سُنّت تمام شد" پڑھا ہے اور اس کا ترجمہ بھی اسی غلط خوانی کے مطابق کیا ہے۔ اس ترقیمے کی عبارت " تحفۃ النصائح من تصنیف حضرت شاہ راجو قتال تمام شد" سے مضمون نگار نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ مصنف کا خود نوشت ہے! کیا مصنف اپنے نام کے ساتھ خود حضرت لکھے گا؟ نسخۂ چہارم کو مضمون نگار نے ناقص الطرفین بتایا ہے، لیکن ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ نسخے کا اختتام ترقیمے پر ہوا ہے اور تاریخ کتابت اور کاتب کا نام فلاں ہے۔ ایک نسخہ جو ناقص الطرفین (دونوں طرف سے ناقص) ہے اس کے آخر میں ترقیمہ کیوں کر محفوظ ہو سکتا ہے؟ ترقیمے کا مقام ہمیشہ نسخے کے آخر میں ہوتا ہے ۔یا تو نسخہ آخر سے مکمل ہے یا مضمون نگار کے بیان میں ابہام ہے۔

عارف نوشاہی، اسلام آباد، ادارۂ معارف نوشاہیہ

naushahiarif@gmail.com

(۲)

ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب کی معرفت معارف اکتوبر ۲۰۲۴ کے شمارے کی سافٹ کاپی کے مطالعے کا موقع ملا۔ بیحد تکلیف پہنچی معارف کے معیار کو دیکھ کر کہ معارف کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہے؟ مثال کے لیے "تحفۃ النصائح" پر اختر النساء کا مقالہ پڑھیں۔ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ غالب کے لفظوں میں:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

یہ مقالہ دراصل محترمہ اختر النساء کی پی ایچ ڈی کا مقدمہ ہے۔ یہ پی ایچ ڈی مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج کے شعبۂ فارسی کی استاد ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔۔۔ کی نگرانی میں کی گئی ہے۔ جب مقدمہ کا یہ حال ہے تو پورے تحقیقی مقالے کا کیا حال ہو گا؟ قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا۔ اس مقالے میں فارسی اشعار اور عبارتوں کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اور جو قرات دی گئی ہے وہ دلچسپی سے بھرپور ہے۔

بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ ایسی ایسی تھیسس جمع ہوتی ہیں اور ان پر ڈگریاں بھی مل جاتی ہیں

اس پر نہ صرف اسکالر کا بلکہ سپروائزر کا بھی احتساب ہونا چاہیے۔ معلوم ہوا کہ یہ تھیسس ڈگری ایوارڈ کے لیے جمع کی جاچکی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب جمع ہوگئی تو وائوا بھی ہوجائے گا، ڈگری بھی ایوارڈ ہوجائے گی۔ پی ایچ ڈی کے بعد یہ محترمہ لکچرر بھی ہوجائیں گی۔

جس اسکالر کو ترقیمہ کا 'تمت' بھی پڑھنا نہ آئے اور اسے 'تمت تمام شد' کی جگہ 'سنت تمام شد' پڑھے، اور 'سنت' کا ہی ترجمہ کرے، 'مِن تصنیف۔۔۔' کو 'مَن تصنیف۔۔۔' پڑھے اور 'مَن' کا ہی ترجمہ کرے، ایسی تھیسس کو تو ڈگری کے لیے قبول ہی نہیں کرنا چاہیے اور سپروائزر کو بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہیے۔

جناب والا! دست بستہ معذرت کے ساتھ ایک بات یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ 'معارف' کی مجلس ادارت میں پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب، پروفیسر اشتیاق احمد ظلّی صاحب اور ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب جیسے عظیم المرتبت اہل علم موجود ہیں، اس کے باوجود ایسے واہیات مقالے معارف میں چھپتے ہیں۔ مدیر صاحب سے مودبانہ التماس ہے کہ اشاعت سے قبل سبھی مقالوں کو اس موضوع کے اکسپرٹ کے پاس بھیجیں۔ اکسپرٹ کی مثبت رپورٹ کے بعد ہی اسے شائع کریں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو معارف کی اشاعت بند کردیں کیونکہ معارف کی جس عظیم الشان عمارت کو ہمارے بزرگوں نے تعمیر کیا تھا، وہ اِس طرح کے مقالوں کی اشاعت سے مسمار ہوتی نظر آرہی ہے[1] بزرگوں کی روحیں بھی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہوں گی۔

عطاخورشید (علی گڑھ)

atakhursheed2012@gmail.com

---

[1] مراسلہ نگار نے بعد میں ایک دوسرے خط کے ذریعے ہم سے درخواست کی کہ نشانزد عبارت نکال دی جائے لیکن ہم نے جان بوجھ کر اس کو رہنے دیا ہے کیونکہ اس سے ہمارے یہاں رائج افراط و تفریط کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ موصوف کو اتنی برق رفتاری سے، اصل تھیسس دیکھے بغیر، اتنی ترش رائے زنی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک غلطی کی وجہ سے سوا سو سال سے نکلنے والا علمی مجلہ ہی بند کردیا جائے جس نے برسوں کی طویل محنت سے علمی دنیا میں ایک شناخت بنائی ہے اور جو اردو دنیا کا قدیم ترین علمی مجلہ ہے۔ عربی میں بھی کوئی اتنا قدیم علمی مجلہ میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر نئے محققین کی ہم اسی طرح ہمت افزائی کریں گے تو اس خاردار میدان میں کون آنے کی ہمت کرے گا؟ میرے خیال میں موجودہ غلطی، مضمون نگار کے عربی نہ جاننے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں محققین کو کسی دوسرے صاحب علم سے پوچھ لینا چاہئے (مدیر)۔

رسید کتب موصولہ

حکیم حافظ ابو یحییٰ محمد شاہ جہاں پوری، **الارشاد الی سبیل الرشاد فی امر التقلید والاجتہاد:** الدار الاثریہ، نئی دہلی، صفحات:۸۴۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر :۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، **باقیات نثر شبلی:** البلاغ پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۱۱۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۴۰ روپے، موبائل نمبر :۹۹۱۴۷۷۶۶۴

مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، **حضور اللہ کے حضور:** کمال بک ڈپو، مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، مئو، صفحات:۲۵۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر : درج نہیں

محمد فضل الرحیم مجددی و محمد شمشاد ندوی (مرتبین)، **حیات وخدمات (مولانا شاہ محمد عبد الرحیم نقشبندی مجددی):** مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، سہارن پور، صفحات:۳۵۲، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر :۹۴۶۰۸۶۶۱۳۰

محمد طارق غازی، **ذکر ک:** دینی کتاب گھر، مسجد قاضی، دیوبند، سہارن پور، صفحات:۴۴۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر :۹۸۹۷۲۷۸۲۶۸

ڈاکٹر شفیع الرحمن، **شاہ مقبول احمد کے فکری جہات:** اردو گھر، حاجی محمد محسن اسکوائر، کولکاتا، صفحات:۴۰۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر :۹۰۰۷۳۴۹۰۸۹

ابو صادق عاشق علی اثری، **علامہ عبد الحمید رحمانیؒ حیات وخدمات:** الدار الاثریہ، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات:۶۷۳، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۴۵۰ روپے، موبائل نمبر :۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵

زریاب احمد فلاحی، **قرآن مجید، مستشرقین اور مسلم فضلاء:** ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ، صفحات:۳۶۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر :۹۸۹۷۶۴۵۵۰

حفیظ الدین احمد، اطہر فاروقی (تلاش وتحقیق)، **نسخہ حفیظ الدین احمد:** انجمن ترقیِ اردو (ہند)، نئی دہلی، صفحات:۶۷۲، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، ای میل: farouqui@yahoo.com

ڈاکٹر محمد قائم الاعظمی، **نقوشِ طنز ومزاح:** امجدی بک ایجنسی، اترولہ، صفحات:۲۲۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت: ۲۰۰، موبائل نمبر :۹۶۹۶۶۴۴۸۹

تصانیف علامہ سید سلیمان ندویؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
خطبات مدراس	150/-	**سلسلۂ سیر الصحابہ،**	
رحمت عالم	60/-	**تابعین و تبع تابعین**	
سیرت عائشہؓ	250/-	سیر الصحابہ اول (خلفائے راشدین)	320/-
حیات شبلیؒ	800/-	سیر الصحابہ دوم (مہاجرین اول)	200/-
یادرفتگاں	350/-	سیر الصحابہ سوم (مہاجرین دوم)	300/-
بہادر خواتین اسلام	40/-	سیر الصحابہ چہارم (سیر الانصار اول)	300/-
تاریخ ارض القرآن (اول و دوم)	550/-	سیر الصحابہ پنجم (سیر الانصار دوم)	200/-
عربوں کی جہاز رانی	160/-	سیر الصحابہ ششم (امام حسنؓ.....کے حالات)	200/-
عرب و ہند کے تعلقات	200/-	سیر الصحابہ ہفتم (اصاغر صحابہ)	300/-
برید فرنگ	150/-	سیر الصحابہ ہشتم (سیر الصحابیات)	100/-
سفرنامۂ افغانستان	100/-	سیر الصحابہ نہم (اسوۂ صحابہ اول)	260/-
انتخابات شبلی	200/-	سیر الصحابہ دہم (اسوۂ صحابہ دوم)	300/-
نقوش سلیمانی	350/-	سیر الصحابہ یازدہم (اسوۂ صحابیات)	75/-
خیام	220/-	اہل کتاب صحابہ و تابعین	210/-
ارمغان سلیمان	250/-	تابعین	250/-
رسالہ اہل سنت والجماعت	30/-	تبع تابعین اول	230/-
دروس الادب (اول)	15/-	تبع تابعین دوم	320/-
دروس الادب (دوم)	20/-	****	

NOV 2024 Vol- 211(11) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
مولانا شبلی پر ایک نظر	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	70/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	600/-
بزم رفتگاں (اول)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	240/-
بزم رفتگاں (دوم)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	250/-
تذکرۃ الفقہا (اول)	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
ابن خلدون	مولانا عبدالسلام ندوی	200/-
حکیم الامت نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
محمد علی (ذاتی ڈائری کے چندورق) اول	مولانا عبدالماجد دریابادی	300/-
محمد علی (ذاتی ڈائری کے چندورق) دوم	مولانا عبدالماجد دریابادی	350/-
متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
تاریخ دولت عثمانیہ (اول)	ڈاکٹر محمد عزیر (علیگ)	350/-
تاریخ دولت عثمانیہ (دوم)	ڈاکٹر محمد عزیر (علیگ)	350/-
ہماری بادشاہی	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی	80/-
تعلیم القرآن	محمد اویس نگرامی ندوی	150/-
اسلامی نظام تعلیم	مولانا سید ریاست علی ندوی	90/-
تاریخ فقہ اسلامی	(ترجمہ) مولانا عبدالسلام ندوی	450/-
اسلام اور عربی تمدن	شاہ معین الدین احمد ندوی	280/-
مسلمانوں کی تعلیم	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	200/-
مقدمہ رقعات عالم گیر	سید نجیب اشرف ندوی	325/-
بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	350/-